www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/10₹

National Council for Promotion of Urdu Language

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

نومبر 2023

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

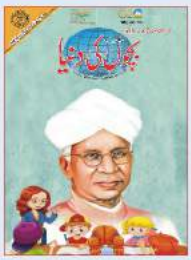

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر:A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:040 - 24415194

جلد: 7 شمارہ: 11 نومبر 2023

مدیر اعلیٰ : پروفیسر دھنجے سنگھ

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020
مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

جہانِ نسواں

شاہ راہِ ادب سے Skywalk نکالنے والی فن کار: پروین شیر — ڈاکٹر محمد کلیم ضیا — 5

قمر جمالی کی افسانہ نگاری — پروفیسر اسلم جمشید پوری — 8

صحت مند معاشرے کی تعمیر میں تعلیم یافتہ خواتین کا کردار — ڈاکٹر حنا آفریں — 12

اردو زبان و ادب کے فروغ میں دبستان مرشد آباد کا کردار — ڈاکٹر سیدہ جنیفر رضوی — 16

مابعد جدید اردو افسانے کا نمائندہ نام: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا — عمران عاکف خان — 19

اردو میں مکتوب نگاری کا فن اور روایت — تبسم ہاشمی — 25

بندر ریچے کی شاعرہ: سائرہ عظیم — ڈاکٹر آفتاب عالم — 29

شاعر ظفر اقبال ظفر اہل نقد کی نظر میں — جبیں نازاں — 32

اردو تحقیق کی روایت — سفینہ خاتون — 36

خواتین ناول نگار: ایک جائزہ — روبینہ پروین — 42

نکہت سخن

شاعرات کے منتخب اشعار — 46

افسانہ

آخر کیوں — پروفیسر نسرین بیگم علیگ — 47

محبت کا قرض — نازنین فردوس — 52

نیند کی گولیاں — شمیمہ صدیق شمی — 55

حسن سخن

رخشاں ہاشمی، شہناز رحمت، ذاکرہ شبنم — 57

صحت

تھائرائیڈ اور خواتین — ڈاکٹر بشریٰ اشرف — 59

قارئین کے خطوط

مراسلہ — 62

مشعل

خواتین نے ابتدا سے ہی ہر میدان میں اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔علم وادب،فن موسیقی،فن مصوری، تدریس غرض ہر میدان میں انھوں نے اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔نثر کی مختلف اصناف میں وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں اور اپنی موجودگی کا احساس معاشرے کو کراتی رہیں۔خواتین نے تنقید نگاری پر بھی توجہ کی اور معاشرے کو یہ باور کرایا کہ وہ ہر علم وفن پر مردوں کے مساوی دسترس رکھتی ہیں۔

اردو ادب میں تنقید کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے۔میر حسن نے 'تذکرۃ الشعرا' اور مصحفی نے 'شعرائے ہندی' لکھی۔ان تذکروں کو تنقید کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا لیکن اردو تنقید کے ابتدائی نقوش ان تذکروں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔'بہارستان ناز' کو اردو شاعرات کا پہلا تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے۔اس سے قبل کسی تذکرے میں خواتین شاعرات کی نشاندہی نہیں ہوتی۔اس کے مولف حکیم فصیح الدین فصیح رنج تھے جن کا تعلق میرٹھ سے تھا۔'تذکرۃ النساء نادری'، 'تذکرہ خواتین دکن' 'تذکرۂ شاعرات اردو' 'تذکرہ نسوان ہند' 'تذکرۃ الخواتین' یہ تمام تذکرے خواتین شاعرات پر مرکوز ہیں۔ان تذکروں میں خواتین شاعرات کا مختصراً تعارف پیش کیا گیا ہے اور ان کی شاعری کا جائزہ سرسری طور پر لیا گیا ہے۔

اردو تنقید نگاری میں بھی خواتین کسی سے پیچھے نہیں رہیں اور زمانے کو باور کرایا کہ خواتین ہر کام بہ حسن وخوبی انجام دے سکتی ہیں۔ممتاز شیریں تنقید نگاری میں وہ پہلا نام ہے جنھوں نے اپنی ذہانت سے اردو تنقید نگاری کو وقار بخشا۔تنقید کے میدان میں انھوں نے اپنے نقوش ثبت کیے اور اردو دنیا میں ان کی پہچان باقاعدہ ایک ناقد کی حیثیت سے ہوئی۔انھوں نے اپنے مضامین سے تنقید کا ایک معیار متعین کیا۔منٹو کے فن سے متعلق ان کی کتاب 'منٹو نوری نہ ناری' ان کے تنقیدی شعور کا عمدہ نمونہ قرار دیا جاسکتی ہے۔ممتاز شیریں کا ناقدانہ شعور بہت پختہ تھا۔انھوں نے اردو تنقید نگاری کو وقار بخشا۔اپنے مضامین اور اپنے افسانوں کے ذریعے انھوں نے اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

ممتاز شیریں سے پہلے خواتین ناقدین کی تحریریں بہت کم نظر آتی تھیں لیکن اس کے بعد اردو تنقید نگاری میں بہت سی خواتین نے طبع آزمائی کی اور اردو تنقید نگاری کی صنف میں بھی اپنے کمالات دکھائے۔

بہت سی خواتین کا تذکرہ بھی اردو تنقید نگاری کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے۔ان میں ایک اہم نام سیدہ جعفر کا ہے۔جن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ان کی بہت سی کتابیں تحقیق وتنقید کے حوالے سے منظر عام پر آئیں۔انھوں نے اردو تنقید وتحقیق کا ایک معیار متعین کیا۔ان کی تنقیدی بصیرت بہت مختلف تھی۔ان تمام خواتین نے اپنے اپنے طور پر بساط بھر تحقیق وتنقید میں نمایاں کردار ادا کیا۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو تنقید نگاری میں بھی خواتین نے اپنا نمایاں رول ادا کیا۔فی زمانہ بہت سی خواتین اردو تحقیق وتنقید میں مصروف عمل ہیں۔یقین کامل ہے کہ مستقبل میں بھی خواتین اردو تحقیق وتنقید میں نمایاں کردار ادا کریں گی اور اس صنف کو مزید عروج بخشیں گی۔

آپ کا

پروفیسر دھنجے سنگھ

ڈاکٹر محمد کلیم ضیا

شاہ راہِ ادب سے Skywalk نکالنے والی فنکار

پروین شیر

فکر وفن کی دنیا میں ہر دور میں کچھ نمایاں شخصیات وجود میں آتی ہیں۔ دنیا خود بخود ان کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے، ایسی نابغۂ روزگار شخصیات عموماً فطری ہوتی ہیں نہ کہ کسبی۔ ان میں ہر لحہ جدت اور اختراعی کیفیات مچلتی رہتی ہیں اور وہ ان کیفیات کو منصۂ شہود پر لا کر دنیا کو متحیر کرتی رہتی ہیں۔

عام طور پر مشاہدے میں یہ بات آتی ہے کہ کسی شخص کے اندر قدرت نے فنِ شاعری کے عناصر رکھ دیے ہیں اور وہ اپنے کلام سے اہلِ علم اور سخن وشوق کے درمیان پذیرائی حاصل کرتا رہتا ہے اور پھر وہ معاشرے میں اپنا ایک مقام بنا بھی لیتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا اس کی گرویدہ ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ایسا شخص مستند ہوجاتا ہے اور اس کا فن بھی سند کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ذکر کسی بھی درجے میں ہو، شعر وسخن کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ میر، غالب، حالی، اقبال اور فیض وغیرہ کے بغیر شعر وادب کی بات کب مکمل ہوئی ہے۔

ذکر صحافت کا ہو یا افسانہ نگاری کا، ڈرامے کا ہو یا ناول نگاری کا، غرض کہ ہر میدان میں اس فن کے اساتذہ موجود ہیں مگر بات صرف کمال حاصل کر لینے کی نہیں ہے بلکہ قدرت نے جو فن ودیعت کیا ہے اس کے صرف اظہار کی بھی ہے جس کی پختگی بھی اس راہ میں اس کی موجودگی کو نمایاں کرتی ہے لیکن اگر کسی فردِ واحد میں بہ یک وقت ایک سے زائد فنی صلاحیتیں موجود ہوں تو اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایسی ہی ایک نمایاں شخصیت پروین شیر کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔

وہ ایک اچھی شاعرہ، بہترین نغمہ گو، ماہرِ ستار اور ایک بہترین مصور بھی ہیں۔ یہ کہنا بہر حال مشکل ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے تصویر بنائی اور اس پر فنِ شعر کا مظاہرہ کیا یا پہلے غزل لکھی اور پھر تصویر کو کینوا س پر اتارا یا پہلے نغمہ گنگنایا اور پھر تصویر وجود میں آئی۔۔۔۔ بہر حال اس قبیل کے منظر نامے میں عمومی طور پر، نغمہ نگار کوئی اور گلوکار دوسرا، موسیقی کسی اور کی نیز مصور مربع کے آخری زاویئے میں نظر آتا ہے۔۔۔۔ مگر قدرت نے پروین شیر کو اس مربع کا مختار کل بنا کر دنیائے حسین میں بھیجا ہے

عصرِ حاضر میں شاعرات کی ماشاءاللہ بہتات ہے اور ہر شاعرہ اپنی بساط بھر اپنے تجربات، مشاہدات، تخیلات اور مطالعے کی زنبیل سے کچھ نہ کچھ مواد معاشرے کے سامنے پیش کر رہی ہے، مگر پروین شیر نے اس منظر کو یک سر تبدیل کر دیا ہے اور قدرت نے جو کچھ انھیں عطا کیا ہے وہ اُس کو اپنے منفرد انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں، شاہ راہ یعنی Highway سے مختلف چھوٹے موٹے راستے تو نکلتے ہیں مگر پروین شیر نے شاہ راہ سے کوئی چھوٹا راستہ نہیں نکالا بلکہ Skywalk کی صورت میں اپنے فنون کو پیش کر دیا۔ انھوں نے صنفی معاملات پر کم ہی گفتگو کی ہے البتہ مسائلِ روزگار ان کا ایک اہم موضوع ہے باوجود اس کہ انھوں نے غزل کی روح کو مرنے نہیں دیا۔ پروین شیر نے انسانی مسائل، ان پر ہونے والے مظالم اور ستم ریزیوں کو بہت قریب سے دیکھا، ان پر غور کیا اور بحیثیت انسان کے وہ تڑپ گئیں تو شعر کی صورت میں وہ معاملات خود بخود در آئے۔ انھوں نے ساحر کی طرح ''جو کچھ ملا اس کو لوٹانے کی بات نہیں کی بلکہ اس پر اظہارِ تاسف کیا۔ اور پھر سوال بندوق کی گولی کی طرح داغ دیا، جس کا نصف حصہ خود جانتی بھی ہیں، عربی کی کہاوت ہے کہ'' حُسن السوال، نِصف العِلم'' ۔۔۔۔ وہ کہتی ہیں۔

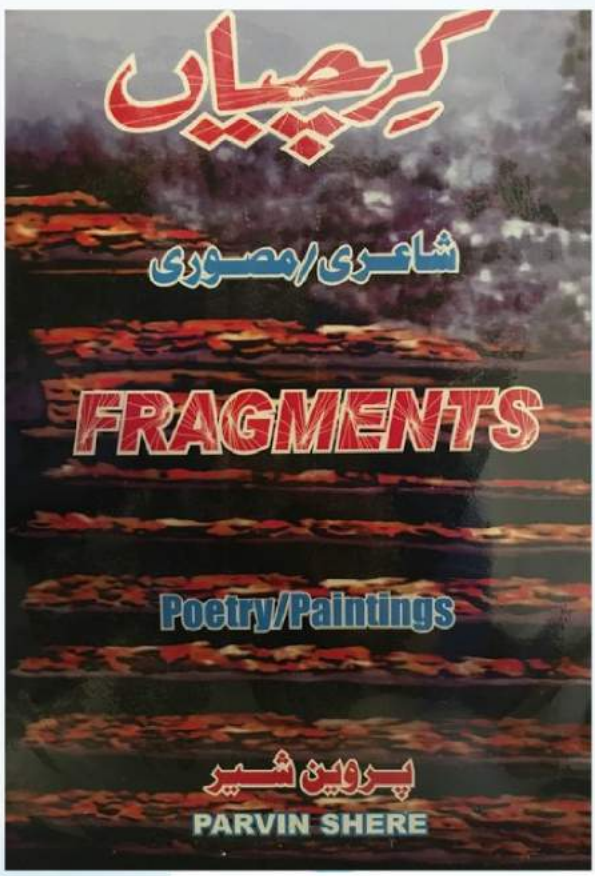

کہیں ٹوٹے کھلونے، کہیں جلتے بستے
ستم گروں نے یہاں کیسے کھیل کھیلے ہیں

ستم گروں کا ستم صرف سرحدوں اور بازاروں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ گھروں، آبادی اور شہروں سے لے کر ان مقامات تک جا پہنچا جہاں معصوم بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں جنھیں ابھی کسی سیاسی داؤں پیچ کا نہ شعور ہے نہ کوئی سروکار، بلکہ ابھی تو ان کی معصوم زندگیوں نے کچھ جاننے کی ابتدا کی ہے۔ یہ ہے وہ درد جو ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

جیے نہیں کبھی تیاریوں میں جینے کی
تمام عمر غموں کے عتاب جھیلے ہیں
زمین کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے تو کر دی
بہاؤ گے خوں اب یہاں اور کتنے ؟
تہوں پر نہیں کھلتی ہی جا رہی ہیں
ہیں چہروں میں چہرے نہاں اور کتنے؟
زمیں خوں سے تر ، آسماں جل رہا ہے
یہ کس راہ پر ہر بشر چل رہا ہے

پروین نے بھی معاشرے میں پائے جانے والے ظلم و جور کی نشاندہی کی ہے۔ جس طرح مہاتما بدھ نے اپنے غور و فکر سے یہ تو جان لیا کہ دنیا میں بہت دکھ ہیں مگر اس کا درماں نہیں بتایا۔ پروین بھی انگلی تو اٹھائی ہے مگر مداوا کہیں نظر نہیں آتا۔ جیسے حالی، اقبال وغیرہ کے یہاں رہنمائی ملتی ہے۔

یہ میری کم مائگی ہے کہ پروین شیر سے مجھے ذاتی ملاقات کا شرف آج سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا اس لیے ان کے تعلق سے جو کچھ بھی تحریری طور پر اطلاعات موصول ہوئیں اسی کی بنیاد پر میں نے انھیں جانا اور سمجھا ہے۔ وہ بہ یک وقت شاعرہ، مصورہ، موسیقی کار یا ستار نواز اور گلوکارہ بھی ہیں ان تمام کے ساتھ ساتھ ایک اچھی انسان بھی ہیں۔ جس کی صرف چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فن کے ذریعے ہونے والی آمدنی کو مصیبت زدہ افراد کے نام کر رکھا ہے۔ آپ کا تعلق علمی گھرانے سے ہے اس لیے یہ کہنے میں میں حق بجانب ہوں کہ انھیں بہت کچھ وراثت میں ملا ہوگا۔ پروین شیر کی شخصیت اور فن کے متعلق اہلِ علم نے اپنی آرا پیش کیں ہیں۔ یہ پروین شیر کے لیے مقامِ افتخار ہے۔ خلیل مامون کہتے ہیں:

''پروین شیر ایک شاعر ہی نہیں مصور بھی ہیں جو مصوری میں شاعری اور شاعری میں مصوری کرتی ہیں۔ ان کے رنگ اور خطوط اپنے منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ ہم ان سے کلام کر سکتے

ہیں گویا پروین کی شاعری ہی جذباتی اور حسی شرکت کے باب وانہیں کرتی بلکہ ان کی مصوری بھی نئے نئے زاویوں سے ہمیں اپنا شریک بنالیتی ہے۔''

اردو دنیا میں گوپی چند نارگ کا نام انتہائی معتبر ہے۔ وہ پروین شیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پروین شیر سچی اور کھری تخلیقیت اور دلِ گداختہ رکھتی ہیں۔''

شمیم حنفی کہتے ہیں:

''ان کی شاعری مدھم راگ کی شاعری ہے اور جو تصویریں وہ وضع کرتی ہیں کبھی لفظوں سے، کبھی رنگوں سے اس کا تاثر بھی دھیمے، نرم آثار آبی رنگوں کا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ذہنی اور جذباتی زندگی کے چاروں طرف جس دائرے کی تشکیل کی ہے وہ ٹھوس اور منجمد نہیں ہے۔ ایک کیفیت ہے بے نام سی اور ایک دھند ہے، بتدریج گہری ہوتی ہوئی۔''

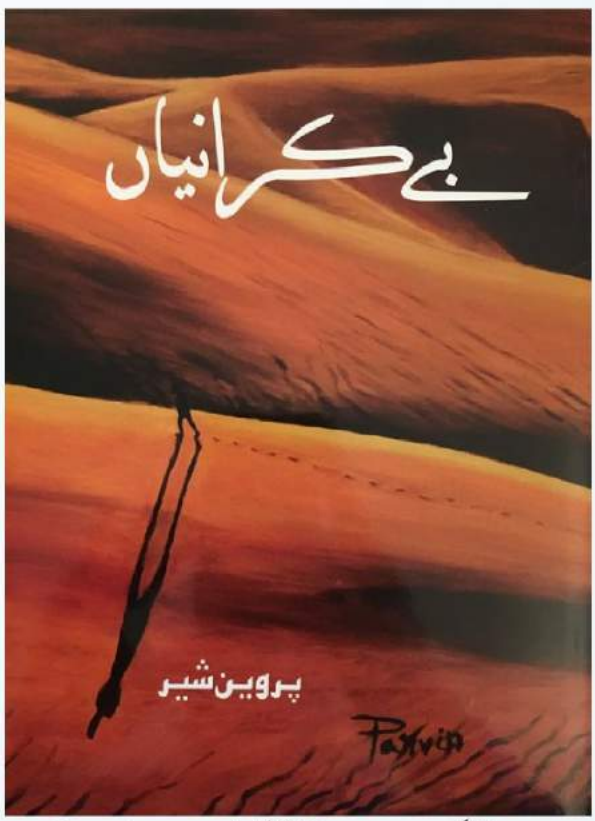

پروفیسر کیتھرہنٹر پروین کے متعلق ایک اور بات کا اضافہ کرتے ہیں کہ:

''وہ شاعر اور مصور ہونے کے ساتھ ساتھ سیاح بھی ہیں اور انھوں نے دنیا کے تمام بڑے براعظموں کی سیر کی ہے، وہاں کے ماحول کو دیکھا، پرکھا اور سیکھا ہے۔''

لہٰذا وہ فرماتے ہیں:

''پروین اپنی تخلیقات میں قدرت اور انسانی فطرت کے دلنواز حسن کو مقید کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہیں۔''

پروین کا پہلا مجموعہ کلام ''کرچیاں'' 2005 میں سید معراج جامی نے اپنے ادارے سے شائع کیا تھا جس میں ان کی شاعری اور ان کا انگریزی ترجمہ مع پروین شیر کی اعلا درجے کی رنگین مصوری سے مزین ہے جس کا سرِ ورق بھی پروین کا تیار کردہ ہے۔ کتاب دائیں اور بائیں دونوں طرف سے کھلتی ہے۔

ان کے فن پر ڈاکٹر سید تقی عابدی، جمیل جالبی، ستیہ پال آنند، حمایت علی شاعر، قمر رئیس، محمد علی صدیقی، امجد اسلام امجد، احمد فراز، عبدالاحد ساز جیسے مایہ ناز فنکارانِ اردو ادب نے خراجِ تحسین اور تبصرے لکھے ہیں۔

پروین شیر کے ''کرچیاں'' کے علاوہ بھی مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا چوتھا مجموعہ کلام ''بے کرانیاں' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی مصور کردہ پینٹنگس بھی مصوری کی مشہور عالمی گیلریوں میں اپنا مقام بنا چکی ہیں اور وہ ان سے ہونے والی آمدنی جنگ زدہ بچوں کے نام کر چکی ہیں۔ ان کی پینٹنگس مہنگے داموں میں صاحبِ قدر لے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ انہی کی آواز میں اور انہی غزلوں کی CD's بھی البم کی شکل میں موجود ہیں جن میں آواز کے جادو سے زیادہ شاعرہ کی فکرِ کلام کی روح بھی موجود ہے۔

بہ یک وقت شاعرہ، مصور، گلوکارہ اور موسیقی نگاری کے ساتھ ساتھ سیاحت نے پروین کے فن میں نکھار پیدا کیا ہے۔ جو بہت کم لوگوں کے مقدر میں آتا ہے۔ ان کے اندر جدت نگاری ہے مگر جدیدیت نہیں ہے۔ ان کا کلام وقت کے ساتھ ساتھ نئی نسل میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور وہی صحیح معنوں میں پروین کے قدرداں ہوں گے۔

□□□

Dr. Mohammad Kaleem Zia
A/103, Rawal Enclave,
Rawal Nagar, Opp: Rawal School &
College Nr: Mira Road Station
Mira Road (East)
Dist: Thane- 401107 (M.S.)
Mob: +9198929 33626

پروفیسر اسلم جمشید پوری

قمر جمالی کی افسانہ نگاری

1970 کے بعد نئی نسل کا ایک قافلہ سامنے آیا جس نے اردو افسانے کو خصوصاً قاری سے جوڑنے کا کام کیا اور بیانیہ کی واپسی عمل میں آئی۔ افسانہ قاری اور زمین سے جڑا اور افسانہ میں حیوانات کی جگہ دوبارہ سے انسانوں کی زندگی عود کر آئی۔ دراصل جدیدیت کے آخری زمانے میں الم غلم واقعات' بے سر پیر کی کہانیاں' کردار سے عاری افسانے' مبہم اور گنجلک علامات کے استعمال نے افسانے کو قاری سے الگ کرنے کا کام کیا تھا۔ قاری تو قاری بعض افسانے ناقدین کی سمجھ سے بھی پرے تھے۔ ایسے میں نئی نسل نے 1970 کے بعد کمان سنبھالی اور اردو افسانے کو دوبارہ سے زندگی عطا کی۔ نئی نسل کے اس قافلے میں ایک معتبر و مستند نام قمر جمالی صاحبہ کا بھی ہے۔

قمر جمالی نے اپنے افسانوں، ناولوں اور تنقیدی ادب کے ذریعہ اردو میں فکشن کا ماحول بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ آپ کے افسانے ہوں یا ناول، ناونوں میں آپ نے اپنے آس پاس کے ماحول، مسائل اور کرداروں کو اقلیتی ڈسکورس کے ساتھ پیش کر کے اردو افسانے میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔

یوں تو آندھرا پردیش اور خصوصاً حیدرآباد میں جیلانی بانو' واجدہ تبسم' رفیعہ منظور الامین وغیرہ نے اردو افسانے میں منفرد انسانی لب و لہجے کا آغاز کیا۔ یہاں مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ قمر جمالی نے اپنے افسانوں اور ناول کے ذریعہ اسی روایتی اسلوب کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔

آپ کے چھ افسانوی مجموعے شبیہ (1990) سبوچہ (1992) سحاب (2001) زُہاب (2007) صحرا بکف (2015) درد کا رشتہ (2019) ایک ناول آتش دان (2014) اور کئی تنقیدی کتب اردو ادب کو دی ہیں۔ آپ کو بہت سے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ آپ کے فن اور سوانح پر مختلف یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے درجن بھر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ساتھ ہی آپ کی کئی کہانیاں اردو سے دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔

آپ کے افسانے اور ناول میں تنہائی کا کرب' دہشت گردی' نوابی سلطنت کا زوال' عورت کی وقعت' مرد اساس سماج' فرقہ پرستی کا پھیلتا ہوا زہر' سیاسی کرپشن' سماجی عدم مساوات' شناخت کا مسئلہ' وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔

اردو افسانے میں کم لوگ ایسے ہوئے ہیں، جنھوں نے کئی عہد دیکھے ہیں۔ افسانے کے نشیب و فراز سے آنکھیں چار کی ہیں۔ قمر جمالی کا نام ایسے ہی معدودے چند افسانہ نگاروں کی فہرست میں آتا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کا شباب اور زوال دیکھا، جدیدیت کی علامت نگاری

اور دلکش اسلوب کو برتا، مابعد جدیدیت میں قصہ پن، کردار اور زمینی مسائل سے آنکھیں چار کیں اور نئی صدی میں آئی ٹی اور سوشل میڈیا کا استعمال بھی کیا۔ افسانے کے اس نشیب و فراز کے درمیان قمر جمالی نے اپنے افسانوں اور ناول میں زندگی کو پیش کرنا جاری رکھا۔ ان کے فکشن میں میں انسان کے ساتھ حیوان کے مختلف روپ ملتے ہیں۔

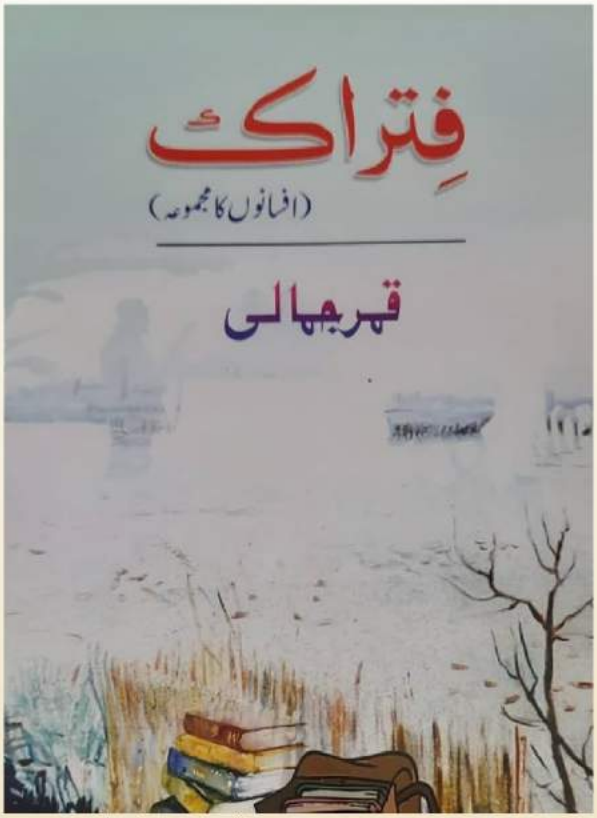

قمر جمالی صاحبہ کے افسانوں میں ترقی پسند نظریے کی شمولیت ان کا زندگی کے بارے میں نظریے کو واضح کرتا ہے۔ ان کے کردار مسلمان بھی ہیں، ہندو اور عیسائی بھی۔ یعنی ان کے یہاں مذہبی تنگ نظری نہیں ملتی۔ وہ سماج میں مذہبی مساوات اور آزادی کو اہمیت دیتی ہیں۔ ان کے افسانے عورت کا درد بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں تاریخی واقعات بھی ملتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانوں کا مطالعہ تاریخی اور لسانی پس منظر میں بھی کیا جانا چاہیے۔ معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی ،ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''قمر جمالی ہمارے عہد کی ایک ایسی سنجیدہ، بالیدہ، جرأت مند اور ہوش مند رائٹر ہیں جنھوں نے اپنی تحریر و تخلیق کے ذریعہ عورت اور مرد کے فاصلے کو ہی نہیں بلکہ زماں و مکاں ،ماضی اور حال کے فاصلوں کو بھی ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کا فکشن صرف دل بہلاوے کا حصہ نہیں بلکہ غور و فکر کا فلسفہ بھی ہے۔ اب وہ اس مقام پر ہیں جہاں افسانہ اور حقیقت کی ساری طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔ وہ تاریخ، سیاست، معاشرت اور آج کی حقیقت سبھی پر یکساں نظر رکھتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے افسانوں کی حقیقت تاریخی اور دستاویزی ہوگئی ہے'' [دیباچہ، علی احمد فاطمی، فتراک، ص۔15]

پروفیسر علی احمد فاطمی کی بات میں سچائی ہے۔ فی الحال میرے سامنے ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ''فتراک'' ہے۔ اس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے اپنے دامن میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ ان میں ہم جیسے کردار ہیں، زندگی کی ریس ہے، آدمی کے مختلف روپ ہیں، روز پیش آنے والے معاملات و حادثات ہیں، کنزیومرزم ہے، بھیڑ میں تنہائی ہے، سماج کی حقیقتیں ہیں، بزرگوں کا اکیلا پن ہے، عورت کی کہانی ،فلیٹ کی زندگی، نئی نسل کی بے روزگاری اور بے راہ روی ہے، مذہبی جنون ہے، تو حب الوطنی کی نئی نئی تعریفیں ہیں اور تخلیقیت کا استعمال، ان افسانوں کو جہاں زندگی کا ترجمان بناتے ہیں تو دوسری طرف حقیقت کا عکاس بناتے ہیں۔ اضطراب، نوائے زندگی، کنفیشن، سفر ہے شرط، یشو دھا کا گئودان / واپسی، ماں، مزار عشق، فیصلہ ابھی باقی ہے، حق بحق دار رسید، افسانے ہی نہیں، زندگی پارے ہیں۔ ان میں چلتی پھرتی زندگی ہے تو عام انسانوں کا درد، عورتوں کا کرب ہے۔ یہ افسانے زندگی کی سچائیوں ،مکاریوں، بداعمالیوں اور معمول کو پیش کرتے ہیں۔

ان کا افسانہ ''اضطراب'' ایک عورت کا افسانہ ہے جو موت سے خوف زدہ ہے۔ سمندر، وہ سمندر جس کی لہروں سے وہ ہمیشہ کھیلتی ہے، اسے خوف زدہ کرتا ہے۔ اسے لگتا ہے لہریں اس کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ وہ سمندر سے ڈر کر بھاگتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں کیا زندگی سے بھرپور جملہ لکھا ہے، ''موت اگر پیچھے پڑ جائے تو زندگی ہی مزاحمت پر اتر آتی ہے''۔ وہ عورت موت سے زندگی کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کی کیفیت کی افسانہ نگار نے بہترین عکاسی کی ہے۔

> ''اب وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگ رہی تھی۔ وہ بھاگتی رہی۔ بس بھاگتی رہی۔ کتنے دن اور کتنی راتیں اسے یاد نہیں۔ اس کے پاؤں لہولہان ہوگئے اور جسم کی ساری توانائی سلب ہوگئی تھی، اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور اس کی بینائی اس کا ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ اب اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور سناٹا تھا۔ وہ بے سُدھ ہوکر

گر پڑی۔ وہ بیہوش نہیں تھی اگرچہ کہ اس کے حواس ساتھ چھوڑنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اس میں ہلنے ڈولنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس نے خود کو دھرتی ماں کے سپرد کر دیا تھا۔ دونوں ہاتھ اور پیر پھیلا کر وہ زمین پر پسر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔'' [افسانہ، اضطراب، قمر جمالی، ص۔26]

بڑا جذباتی قسم کا افسانہ ہے۔ ایک عورت کی کہانی، جو اپنا، بے حد پیار کرنے والا شوہر کھو چکی ہے، بالکل اپنا رل ہو جاتی ہے، جسے اس کی بیٹیاں سنبھالتی ہیں۔ اسی طرح کا افسانہ ''کنفیشن'' بھی ہے۔ یہاں بھی ایک عورت ہے جس کا استحصال ہوتا ہے۔ وہ خود متاع کوچہ و بازار بن جاتی ہے۔ وہیں اسے پیٹر سن ملتا ہے۔ جو اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات پیٹر سن کی دادی سے ہوتی ہے۔ پیٹر سے اسے ایک لڑکا بوب ہوتا ہے۔ پیٹر غائب ہو جاتا ہے۔ آخر میں وہ اپنے گناہوں کا کنفیشن چرچ میں کرتی ہے۔ آپ بھی دیکھیں آخر میں افسانہ کیا موڑ لیتا ہے۔

''اوہ فادر ـــــ !!''

وہ گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

''آئی ایم سوری فادر۔''

''ریلیکس ـــــ کوئی بات نہیں۔''

انھوں نے سلویا کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ فادر کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر جانی پہچانی مسکراہٹ دیکھ کر وہ سہم گئی اور پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے یک ٹک دیکھتی رہی۔

''پپ ..... پپ ..... پی ..... پیٹر تم ـــــ ؟!!''

فادر کا چہرہ ایک دم پُر جلال ہو گیا۔ پیشانی کی رگوں میں تناؤ آیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ سلویا کی پیشانی سے کھینچ لیا۔

''فادر پیٹر اینڈ رسن ـــــ !!''

انھوں نے گرج دار آواز میں اعلان کیا اور بھاری قدموں سے چرچ ہال کی طرف بڑھ گئے۔ سلویا حیرت سے کھلے ہونٹ اور حسرت سے پھیلی آنکھوں سے بڑی دیر انہیں تکتی رہی۔'' [افسانہ، کنفیشن، قمر جمالی۔ ص۔63]

قاری سوچتا رہ جاتا ہے۔ یہ کنفیشن کس کا ہے؟ سلویا کا یا پیٹر کا؟ یا پورے سماج کا؟ قاری مبہوت رہ جاتا ہے۔ کنفیشن دراصل اپنے گناہوں پر ندامت ہے۔ سب کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا، گناہ کرنے سے زیادہ مشکل امر ہے۔ کیا پیٹر، سلویا اور بوب کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل کر، کنفیشن کرتا ہے اور بچپن کی خواہش کے مطابق 'فادر' بن جاتا ہے۔ سلویا اسے فادر کی شکل میں دیکھ اور پا کر حیران بھی ہوتی ہے اور خوش بھی۔

''نوائے زندگی'' ایک عورت کی تنہائی کی کہانی ہے۔ وہ عورت کبھی آباد گھر میں ہوتی ہے شوہر کے نہ رہنے اور اب بیٹے، بیٹیوں کے باہر جاب کرنے سے تنہائی کی شکار ہے۔ کہانی کی شروعات ہی اس طرح ہوتی ہے۔

''وہ کب سے اپنے آنگن میں بے سائبان بیٹھی تھی۔''

اس ایک جملے میں پوری داستان ہے۔ آنگن اور بے سائبان۔۔ جبکہ آسمان موجود ہے۔ یہاں سائبان سے کچھ اور مراد ہے۔ ایک عورت، اپنے شوہر کے بعد کیسی بے سائبان ہو جاتی ہے۔ بچے صبح و شام فون کرتے ہیں۔ ویڈیو کال کرتے ہیں۔ ضرورت کے ہر سامان کا خیال رکھتے ہیں۔ وقت پر کورئر سے سب کچھ آجاتا ہے۔ مگر ساتھ رہنے کی جو رفاقت اور محبت ہوتی ہے وہ کسی بازار، کسی دکان میں نہیں ملتی۔ ایک عورت کو اور بھی کچھ چاہئے۔ اسے گھومنے پھرنے کی آزادی، لوگوں کا ساتھ اور زندگی کے ہنگامے چاہیے۔ اس لیے تنہائی کا عذاب جھیلتے جھیلتے جب وہ تھک جاتی ہے تو سیمینار میں جانے کا اعلان کر دیتی ہے۔

''اتنے دن مام ـــــ !''

''ہاں۔ دو روزہ انٹرنیشنل سمینار ہے۔ مجھے صدارت کے لیے بلایا ہے۔ میں نے کنفرم کر دیا ہے۔ دو روز اس میں لگیں گے۔''

''باقی دن ـــــ ؟''

''اپنی دوست کے گھر رہوں گی۔ گھوموں گی ـــــ پھروں گی۔ ابھی کچھ دیر قبل زندگی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کی آواز سنی۔''

[افسانہ، نوائے زندگی، قمر جمالی، ص۔45]

قمر جمالی کا بہت معروف افسانہ ''یشودا کا گئودان'' ہے۔ یہ افسانہ دراصل پریم چند کے مشہور ناول ''گئودان'' کی توسیع ہے۔ یہ افسانہ متن بر متن، کی مثال ہے۔ اس ناول پر علی ضامن نے متن بر متن کے تحت ناول ''گئودان کے بعد'' لکھ کر سب کو چونکا دیا۔ اردو میں یہ اپنے آپ میں پہلا ناول ہے۔ راقم نے ایک افسانہ ''گئودان کے بعد'' 2019 میں لکھا تھا، جو آج کل میں شائع ہوا اور میرے مجموعے کا سرنامہ بھی بنا تھا۔

قمر جمالی نے اپنے اس افسانے میں عورت کے درد کو دکھایا ہے۔ اس کہانی میں روپالی اور اس کی دادی یشودا ہے۔ اور بہت دن بعد سامنے آنے والے گوبر کا کردار ہے۔ برسوں بعد جب گوبر نے بتایا کہ ہیضہ کی بیماری میں سب مر کھپ گئے تو دادی کو بہت دکھ ہوا۔

''گوبر نے بتایا کہ گاؤں میں ہیضہ پھوٹ پڑا اور ماں، جھنیا اور للو، سب کو سمیٹ لے گیا۔ البتہ منگل کو مالتی دیوی لے گئی تھیں۔ وہ رہ گیا۔ ہوری کے گذرتے ہی، خود ڈیوٹی پر کلکتہ لوٹ گیا تھا، اس لیے بچ گیا۔''

[افسانہ، یشودا کا گئودان، قمر جمالی، فتراک، ص۔114]

گوبر کے دل میں روپالی کے تئیں پیار تھا جبکہ روپالی اس سے، اس کے رہن سہن، پہناوے وغیرہ سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس کے ماں باپ گئودان کا ارمان لیے پرلوک سدھار گئے۔ دادی کو گائے پالنے اور گایوں کو نہارنے کا شوق مذہبی جنون کی حد تک تھا۔ وہ گئودان کرنا چاہتی تھیں۔

پہاڑوں کے دامن میں واقع گاؤں میں امن وامان تھا لیکن باہر کی تعلیم اور نئی نسل کے نوجوانوں نے ایک الگ قسم کی تہذیب پھیلا دی تھی، جس کے سبب وہاں ایک دن فساد پھیل پڑا۔ بہت سے لوگ اس کی نذر ہو گئے۔ جو بچ گئے تھے وہ، اس علاقے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مصنفہ نے اجڑنے اور دوبارہ بسنے کے عمل کو فطری طور پر دکھایا ہے۔ گوبر موقع بہ موقع روپالی کے قریب آتا ہے، جبکہ روپالی اسے نفرت سے دور کرتی رہتی ہے۔

''دور ہو جا____''

روپالی غصہ میں تو تھی ہی۔ گوبر کو سامنے دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئی۔

''جھنیا جی! اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں۔''

''کون جھنیا____؟ میں روپالی ہوں۔''

ہمارے لیے تو تم جھنیا ہی ہو۔ مائی سے بات کر لی ہے۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ اتنی بڑی دنیا میں تم اکیلی عورت کیا کروگی۔! مائی نے کہا؟ تو میں مان گیا۔ آخر میرے سینے میں بھی انسان کا دل ہے۔ پیسے گا ہی۔ تم فکر نہ کرو____ میں مائی کے لیے ایک اچھی سی گئیا لا دوں گا۔ جیتے جی سیوا کرے گی اور مرنے سے پہلے
گئودان بھی ہو جائے گا۔''

''تیری اتنی ہمت____ جاتا ہے کہ.....''

روپالی اس کے پیچھے مارنے دوڑی۔

[افسانہ، یشودا کا گئودان، قمر جمالی، ص۔116]

ایک طوفان نے روپالی کے ارمانوں کو پانی پانی کر دیا۔ جب سب اپنا گھر بار چھوڑ کر جائے پناہ کے لیے بھاگ رہے تھے وہ دادی سے بچھڑ گئی۔ طوفان گزرنے کے بعد جب وہ دادی کو ڈھونڈنے واپس وہیں آتی ہے، تو اسے دادی کی لاش ملتی ہے۔ دادی کے ہاتھوں میں ایک گائے کی ڈور ہوتی ہے۔ گائے ایک پیڑ کے نیچے دبی مری پڑی ہے۔ اور سامنے گوبر کھڑا ہے۔

کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کئی سوال چھوڑ جاتی ہے۔ کیا دائی کا گئودان کا ارمان پورا ہو جاتا ہے؟ کیا گوبر روپالی کی زندگی میں آتا ہے۔؟ کیا مصنفہ دادی نے دادی کا ارمان پورا کرنے کے لیے طوفان دکھایا ہے؟ لیکن ان سب سوالوں کے درمیان، قاری سوچتا ہے کہ یہ سب فطری ہے کہ نہیں۔؟ کہانی کا اختتام غیر فطری لگتا ہے۔

ان سبھی کہانیوں میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان میں عورت کا کردار کتنا اہم ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ مرکزی حیثیت میں ہیں۔ عورتوں کا کرب اور ان کا مرد اساس سماج میں ردعمل سامنے آتا ہے۔ دادی کا کردار قمر جمالی کے افسانوں میں اکثر ہوتا ہے اور دمدار کردار ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ عوامی بیداری خصوصاً عورت کی حالت اور اس میں آئی تبدیلی کو بہتر طور پر نشان زد کیا ہے۔ یہ افسانے قمر جمالی کو اردو افسانے میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

□□□

Prof. Aslam Jamshedpuri
Urdu Department
Chaudhary Charan Singh University,
Ramgarhi
Meerut-250001(U.P)

ڈاکٹر حنا آفریں

صحت مند معاشرے کی تعمیر میں تعلیم یافتہ خواتین کا کردار

انسان کو اپنے بچوں کی تربیت کی فکر اسی وقت سے محسوس ہونے لگی تھی جب اس نے جنگلوں سے نکل کر ایک گروہ کی شکل میں بستیاں بسا کر معاشرتی زندگی کا آغاز کیا تھا تا کہ اس کا بچہ بڑا ہو کر معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرے۔ غالباً اعلیٰ قدروں کی تربیت کے لیے ہی تعلیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ فلسفۂ تعلیم کے ماہرین اور بچوں کی نفسیات کے ماہر اس بات سے کلی طور پر متفق ہیں کہ بچوں کی کردار سازی میں والدین اور اساتذہ کی برابر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ فرد سے معاشرہ اور معاشرے سے تعلیمی اداروں کا وجود عمل میں آتا ہے۔ یعنی بچوں کی تربیت کے لیے فرد، معاشرہ اور تعلیمی ادارے ایک تثلیث بناتے ہیں۔ والدین جن میں خصوصی طور سے ماں کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔

بچوں کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے اور سیکھنے کا یہ زمانہ پندرہ بیس سال تک کی عمر کا موزوں ترین زمانہ ہے۔ اسی زمانے میں بچے کو تعلیم و تربیت کے ذریعے انسان بنانے کا عمل جاری رہتا ہے۔ خدا کی تمام مخلوق میں انسان کے بچے کی تعلیم و تربیت کا زمانہ ہی سب سے طویل ہوتا ہے۔ جو والدین اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کی صحیح پلاننگ نہیں کرتے ان کے بچے زندگی میں صحیح سمت حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ اگر ماں گھر میں اچھی تربیت اور ماحول فراہم کرے تو بچہ ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند ہوگا کیونکہ بچے پر ماں کا اثر سب سے زیادہ مرتب ہوتا ہے۔ بچہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارتا ہے۔ ماں اپنے بچے کو اچھی تربیت کے ذریعے زندگی کے نشیب و فراز سے واقف کراتی ہے۔ مستقبل میں ایک اچھا شہری بننے اور انسانیت کی بقا میں تعاون کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ گھر کی زندگی سے ہی بچے کو انسانوں کے باہمی رشتوں اور

تعلقات کا علم ہوتا ہے۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے حقوق کو الگ الگ کر کے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ گھر میں رہ کر بچے کے مختلف نظریوں اور رویوں یعنی کردار کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور پھر اسی بنیاد پر معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ ہونے میں مدد ملتی ہے۔ دراصل گھر اور خصوصاً ماں کے ذریعے ہی بچے کو سماج سے متعلق وہ سبق ملتا ہے جس کی وجہ سے اسے سماجی زندگی بسر کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ بچے کے سامنے ہر صورت حال میں ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تاکہ اس کی تمام تر منفی صلاحیتیں تغیر پذیر فطرت کے باعث اچھی شکل میں بروئے کار آسکیں۔ اگر گھر کا ماحول مناسب اور سازگار ہوگا تو بچے میں ہمدردی، محبت، خدمت، یگانگت اور میل ملاپ کے جذبات نمایاں ہوں گے اور اگر گھر کا ماحول ناپسندیدہ اور ناخوشگوار ہوگا تو رقابت، نفرت، غصہ، حسد، غیبت اور احساسِ کمتری کے جذبات ابھریں گے جن کی وجہ سے بچے کی شخصیت ساری عمر کے لیے مجروح اور ناکارہ ہوجاتی ہے۔ غرض بچہ اپنے گھر کے ماحول کے مطابق سیکھتا ہے۔ گھر کا ماحول ہی بچے کو فیاض بناتا ہے اور گھر کا ماحول ہی اسے تنگ نظر بناتا ہے۔ بچے میں فطرتاً سیکھنے اور فروغ پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کو صحت وصفائی کی طرف مائل دیکھ کر خود صحت وصفائی کی جانب توجہ دینے لگتا ہے۔ ماں کے کھانے پینے، گفتگو کرنے، اٹھنے بیٹھنے اور سونے کے طریقے کو دیکھ کر بچہ خود بخود ان کی نقل کرنے لگتا ہے۔ غیر شعوری طور پر وہ ماں سے محبت وشفقت، ہمدردی وخلوص، تعاون اور مختلف عادات واطوار سیکھتا ہے جو اس کی تربیت وپرورش کے لیے نہایت اہم ہیں۔ بچے کے لیے اس کی ماں ایک معلم کا کام کرتی ہے کیونکہ اس کے حرکات وسکنات کی تقلید کر کے بچہ خود میں مختلف اوصاف متصف کرتا ہے۔ اس کے معصوم ذہن پر گھریلو زندگی کے جو نقش اپنی چھاپ چھوڑتے ہیں وہ زندگی بھر قائم رہتے ہیں۔

بچے کو ماں کی توجہ، محبت اور خلوص کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا ماں کو اس کی عمر کے مطابق مناسب کھیلوں اور کھلونوں کا انتظام کرنا چاہیے۔ ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے اور عزیزوں سے میل ملاپ کے مواقع فراہم کر کے ہر ماں بچے میں معاشرتی تربیت کرتی ہے۔ لیکن تعلیم یافتہ ماں یہ بھی نظر رکھتی ہے کہ اس کا بچہ بُری صحبت اور بُری عادتوں میں تو گرفتار نہیں ہو رہا ہے۔ اچھی ماں نہایت آسانی کے ساتھ خامیوں کو دور کر کے خوبیوں کو اجاگر کر سکتی ہے۔ بچوں کے سوالات کو صبر کے ساتھ سننے اور پھر سنجیدگی سے ان کے جوابات دینے سے بچے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ان کی جستجو اور تحقیق کی جبلت کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔

وقتاً فوقتاً بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے جو اُن کی شخصیت کی نشوونما کے عمل میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔ بچوں کے ذہن اور جسم کی صحیح نشوونما کے لیے انھیں نصیحت آمیز کہانیاں اور واقعات سنا کر ان میں اچھے اخلاق کے اوصاف کا احساس پیدا کرنے میں ماں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ گھریلو کام کاج میں بچے کو ہاتھ بٹانے کے مواقع فراہم کر کے ان میں محنت، احساسِ ذمہ داری اور تعاون کی صلاحیتوں کو فروغ دیتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ ماں ہی بچے کی فطری صلاحیتوں کے مطابق اسے مختلف تعمیری کاموں میں مصروف رکھ کر اس کی صحیح رہ نمائی کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے کیوں کہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں گی تو بہتر سمجھ رکھ کر اپنے بچے کی اچھی تربیت کر سکتی ہیں جس سے بچہ ایک اچھا شہری بنے گا۔ ایک اچھا شہری ملک وقوم کے مستقبل کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جیسے جیسے امتحانات کے دن قریب آتے ہیں، بچوں کے ذہنی تناؤ میں اضافہ ہونے لگتا ہے بلکہ بعض بچے تو امتحان کے خوف سے خودکشی تک کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ بورڈ کے امتحانات کے وقت بچوں کی خودکشی کرنے کی خبر آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ یہ دلدوز واقعات بچے کی اچھی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔ اگر بچے کو گھر میں شروع سے ہی مشکلوں کا سامنا کرنے، امتحانات کی اچھی تیاری کرنے، اپنے وقت کو بہتر طریقے سے استعمال کرنے اور مستقبل میں اپنی بہتر کارکردگی سے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب و تربیت ملتی رہتی ہے تو مسئلہ کافی حد تک حل ہو جاتا ہے۔ والدین خصوصی طور پر ماں کو اپنے بچے کو زندگی کی ناکامیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور پہلے سے زیادہ ہمت وحوصلہ سے کام کرنے کی تربیت فراہم کرنی چاہیے تاکہ ناخوشگوار حالات سے بچوں کو بچایا جاسکے اور ایک صحت مند معاشرے کو جنم دیا جاسکے۔

جو مائیں اپنے بچوں کی تربیت کے لیے خاطر خواہ وقت نکال کر ان کی ہمہ جہت ترقی کی کوشش کریں گی تو ان کے بچوں کو نہ تو گھر اور نہ ہی تعلیمی اداروں میں ذہنی تناؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ بچے خود ہی وقت پر اسکول کا کام، کھیل اور جسمانی صحت کے لیے موزوں ترین وقت طے کر کے اپنے سارے کام پورے کرلیں گے۔ طلبہ سے متعلق اسکولوں میں خواہ کتنے قوانین وضوابط بنا لیے جائیں لیکن جب تک ان کو گھروں میں اچھی تربیت حاصل نہیں ہوگی تب تک وہ اسکول کے ضابطوں کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے۔ تعلیم یافتہ ماں بچوں کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کے ساتھ ان کی تربیت کرتے وقت ان کی عزتِ نفس اور ان کے جذبات کا بھی

خیال رکھتی ہے۔ بچے کی غلطی پر انھیں تنبیہہ دوسروں کے سامنے خاص طور سے ان کے دوستوں کے سامنے نہیں کرتی۔ بچوں کو ابتدا سے سچائی کے راستے پر چلانا اور عدل وانصاف کا عادی بنانا والدین کا ہی کام ہے۔ اس کے لیے ان کے سامنے جھوٹ بولنے اور کسی شے کی غلط تقسیم سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ وہ سچائی اور انصاف کی خوبی کو سمجھیں اور معاشرے میں بے انصافی اور ظلم سے پرہیز کریں۔

ماں کو بچوں کی جسمانی صحت کا بھی بھرپور دھیان رکھنا چاہیے کیوں کہ ایک صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ پروان چڑھتا ہے اور جب جسم و دماغ صحت مند ہوں گے تو بچے کی قدرتی صلاحیتیں اور اچھے اقدار بروئے کار آئیں گے۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب ماں تعلیم یافتہ ہوگی کیونکہ ماں کے ذریعے بچے کو جو تعلیم ملتی ہے وہ زندگی بھر کام آتی ہے۔ بقول پروفیسر برٹرینڈ رسل:

'ایک اچھی ماں سیکڑوں استادوں سے بہتر ہوتی ہے اور ایک اچھا گھر سیکڑوں مدرسوں سے اچھا ہوتا ہے۔'

غرض عورت کی تعلیم اس کی گھریلو زندگی کے لیے ایک مضبوط بنیاد کا کام کرتی ہے جس سے وہ گھر کو صاف ستھرا رکھنے کے ساتھ خوبصورت معاشرے کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔ تعلیم کی وجہ سے اسے بچے کی اچھی تربیت کا ادراک ہوگا۔ بچے کے مستقبل کا دھیان وہ بہتر طریقے سے رکھے گی۔ تعلیم یافتہ خواتین اپنی صحت کا دھیان رکھیں گی جس سے ان کی کوکھ میں پلنے والا بچہ بھی صحت مند ہوگا۔ صحت مند جسم میں ہی صحت مند ذہن ہوتا ہے۔ اس لیے صحت مند معاشرے کے لیے خواتین کا اپنی صحت کے متعلق بیدار ہونا بھی ضروری ہے۔ تعلیم یافتہ خواتین اپنی صحت کے ساتھ اپنے بچوں کی صحت کا بھی دھیان رکھیں گی۔ وہ زیادہ بچوں کے بجائے کم بچوں کی پیدائش پر زور دے کر ان کی بہتر تعلیم وتربیت کر سکتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم میں نابرابری غالب ہے۔ تعلیم اس نابرابری کے فرق کو واضح کرتی ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہی خواتین کو اپنے حقوق کی معلومات نہیں ہوتی اور وہ ظلم، استحصال کا شکار رہوتی ہیں۔ تعلیم یافتہ خواتین طاقتور بن کر اپنے حقوق کی لڑائی بھی لڑ سکتی ہیں۔ کم عمر میں شادی ہو جانے کی وجہ سے بچوں کی صحت سے متعلق انھیں معلومات نہیں ہوتی ہے جس سے بہت سے بچے بچپن میں ہی موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر خواتین تعلیم یافتہ ہیں تو وہ ناکافی غذائیت کی وجہ سے بچے کی موت کو بھی کم کر سکتی ہیں۔

خواتین کو تعلیم یافتہ بنانے سے غریبی پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے۔ وہ گھر کے کام نبٹانے کے بعد باہر بھی کام کر کے ذریعۂ آمدنی بڑھا سکتی ہیں۔ اس طرح اپنے گھر کو بہتر طریقے سے چلانے کے لیے تعلیم یافتہ خواتین شوہر کی مدد کر سکتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے کام میں ہاتھ بٹا کر انھیں کوئی اچھا مشورہ بھی دے سکتی ہیں۔

خواتین کے لیے بنیادی تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم بے حد ضروری

ہے جہاں پر انھیں روک لگا دی جاتی ہے جب کہ یہی وہ عمر ہے جب وہ چیزوں کو بہتر طریقے سے سمجھنے کی سمجھ رکھتی ہیں۔لڑکیوں کا اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ والدین کی یہ سوچ ہے کہ ان پر تعلیم کے لیے روپیہ خرچ کرنے سے بہتر ان کی شادی کرنا ہے۔لڑکے تو گھر کی آمدنی میں اضافہ کریں گے جب کہ لڑکی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شادی کر کے دوسرے گھر چلی جائے گی۔لہٰذا وہ گھر کی آمدنی کے ذرائع بڑھانے میں مددگار و معاون ثابت نہیں ہوسکتی۔دوسرے یہ کہ والدین حفاظتی اقدام اٹھاتے ہوئے بھی اسکول دور ہونے پر لڑکیوں کو وہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے نہیں بھیجتے ہیں۔

بالغ ہوتے ہی لڑکی کی شادی کر دی جاتی ہے جس سے اس پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حاملہ ہو جاتی ہے۔ معلومات نہ ہونے کے سبب اسے ڈھیروں بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ دن بہ دن کمزور ہوتی چلی جاتی ہے جس سے پیدا ہونے والا بچہ بھی کمزور پیدا ہوتا ہے۔بچہ معاشرے کا ایک صحت مند فرد نہیں بن پاتا ہے اور صحت مند معاشرے میں مددگار ثابت نہیں ہو پاتا۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے گھر کے بزرگوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔تبھی وہ اپنی بچیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول بھیجیں گے۔تعلیم یافتہ ہونے پر ہی ان میں یہ سمجھ پیدا ہوگی کہ لڑکیوں کی تعلیم نہ صرف ان کے لیے بلکہ صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے بھی اہم ہے۔اساتذہ لڑکیوں کے والدین کو یہ بات سمجھائیں کہ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوں گی تو وہ اپنی اور گھر کے متعلق اچھی سوچ رکھیں گی۔اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں وظائف دینے چاہیے تاکہ وہ والدین کے خرچ کے بغیر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔اسکول دور ہونے کی صورت میں لڑکیوں کے لیے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام ہونا چاہیے تاکہ وہاں ان کی بہتر تعلیم و تربیت ہو سکے۔اسکول و بورڈنگ ہاؤس میں گورنمنٹ کی جانب سے کھانے کا انتظام ہونے سے تعلیم حاصل کرنے میں والدین کی دلچسپی بڑھ سکتی ہے۔گورنمنٹ ان سب کاموں کو ترجیح دے تو والدین کا بھروسہ بڑھے گا اور وہ اپنی لڑکیوں کو اسکول بھیجنے لگیں گے۔

ایک تعلیم یافتہ خاتون غیر تعلیم یافتہ خاتون کی بہ نسبت زیادہ ہنرمند اور خود اعتماد ہوگی۔وہ ایک اچھی ماں اور ایک اچھی شہری بن کر ملک و قوم اور گھر کے لیے اچھا کام کر سکتی ہے۔تعلیم یافتہ خواتین صحیح عمر میں شادی کریں گی اور کم بچوں کی پیدائش پر زور دیں گی۔ساتھ ہی صحت کے متعلق معلومات ہونے کے سبب بچوں کے مرنے کی تعداد میں بھی کمی آئے گی۔رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ جس گھر میں ماں تعلیم یافتہ ہوگی وہاں بچوں کے مرنے کی تعداد میں کمی ہوگی۔کیوں کہ وہ لڑکی صحت مند جسم کے ساتھ صحت مند بچے کو جنم دے گی۔صحت مند بچہ ہی معاشرے کا محافظ ہوسکتا ہے۔:

لڑکیوں کی بہتر تعلیم کے لیے لچک دار نظام اوقات ہونا چاہیے۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے خاتون اساتذہ کا ہونا لازم ہے تاکہ وہ ان سے تعلیم حاصل کرنے میں کسی قسم کی شرم محسوس نہ کریں۔لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ضرورت کے مطابق انھیں تعلیم دی جائے۔ان کی وہ تعلیم مادری زبان میں ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔خواتین کو ان مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔کیوں کہ انھی کے کندھوں پر ایک صحت مند معاشرے کا انحصار ہے۔ایک ماں ہی بچے میں تحصیلِ علم کا شوق پیدا کر کے ان میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔بچے میں کام کے لیے رغبت اس طرح پیدا کرتی ہے کہ وہ سماج میں تخلیقی رول ادا کر سکے۔مشترک زندگی کا سبق سکھاتی ہے تاکہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہے اور دوسروں کی مدد کر سکے۔ایک ماں ہی بچے کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو و نما کرتی ہے تاکہ بچہ کسی کے لیے بوجھ نہ بن کر دوسروں کے کام آسکے۔

موجودہ دور میں سماجی کشمکش اور اتھل پتھل کی وجہ سے بے اصول زندگی اپنے شباب پر ہے۔خود غرضی، خود سری اور خود پرستی کا زور ہے۔ایسے دور میں والدین خصوصاً ماں کا جدید اصولوں سے واقف ہونا بے حد ضروری ہے۔وہ اگر تعلیم و تربیت کے جدید اصولوں سے واقف ہے تو ان کو عملی جامہ پہنا کر صحت مند سماج بنا سکتی ہے اور انسانی زندگی کو سنوار سکتی ہے۔لہٰذا مندرجہ بالا باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا ازحد ضروری ہے۔

□□□

Dr. Hina Afreen
Assistant Professor,
Academy of Professional Development of Urdu Medium Teachers
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

ڈاکٹر سیدہ جنیفر رضوی

اردو زبان و ادب کے فروغ میں دبستان مرشد آباد کا کردار

دبستان کا لفظ ادبی اصطلاح کے طور پر شروع ہی سے استعمال ہوتا رہا ہے اور عام طور سے مدرسہ فکر یا مکتب فکر کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے School of thoughts لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ مخصوص شعری نظریات اور رجحانات ایک دبستان کو جنم دیتے ہیں یعنی جب کسی مخصوص دور اور خطے کے ادیب اور شاعر اپنے دور کے تہذیبی، سیاسی وثقافتی حالات، فکرو نظریات، رجحانات، طرز بود و باش اور سماجی اقدار سے شعوری طور پر متاثر ہو کر کوئی ادب (چاہے وہ شاعری میں ہو یا نثر میں) تخلیق کرتے ہیں تو ایک دبستان وجود میں آتا ہے۔ اسی بنیاد پر اردو شاعری کو متعدد دبستانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور ہر ایک دبستان کی منفرد عوامل اور عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ جب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ دبستان کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے تو ہمارے ذہن میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کا نام سب سے پہلے آتا ہے، کیونکہ دبستان کی بحث سب سے پہلے انہیں دو دبستانوں کے شعرو ادب کے موازنے کے ذریعے شروع ہوتی ہے اور اسی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں دبستانوں کو اردو شاعری کے لحاظ سے مستقل) اہم مقام) حیثیت حاصل ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری کا بیشتر سرمایہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کا مرہون منت رہا ہے، تاہم یہ دونوں دبستان ہماری تمام اردو شاعری کا احاطہ نہیں کرتیں ہیں۔ اردو شاعری کا دور چودھویں صدی عیسوی سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے اور اردو شاعری اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ اکیسویں صدی میں بھی اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہم یہاں دبستان دہلی اور لکھنؤ سے قطع نظر دوسرے دبستانوں کی بات کریں جن میں اردو شاعری کے مختلف مراکز شامل ہیں اور جہاں شعرو ادب کی محفلیں آباد ہوئیں۔ ان مراکز میں رام پور، عظیم آباد، بھوپال، مرشد آباد، حیدر آباد، لاہور اور کراچی وغیرہ قابل ذکر مراکز شامل ہیں۔ ان میں سے بعض شہر ایسے تھے جنھیں اس دور میں بھی علمی و ادبی مراکز کی حیثیت حاصل تھی جب دہلی اور لکھنؤ اپنے شباب پر تھا اور ان میں بعض شہروں کی رونق اس وقت بڑھی جب یہ دونوں دبستان انقلاب زمانہ کی زد میں آئے اور وہاں کے ادبا و شعرا دوسرے دبستانوں کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ ان دبستانوں میں ایک اہم نام مرشد آباد کا بھی ہے۔ جہاں پر سینکڑوں شعرا انقلاب زمانہ کے بعد اس شہر میں تشریف لائے اور شہر مرشد آباد نے ان شعرا کو اپنی پلکوں پہ بٹھایا۔

مرشد اباد بنگال بہار اور اڑیسہ کی سابق راجستھانی اور ایک قدیم تاریخی

شہر ہے اردو شعروادب کی ترقی میں دبستان مرشد آباد کی اہمیت مسلم ہے اور اس کی اہمیت سے کوئی بھی شاعر وادیب انکار نہیں کرسکتا۔ مرشد آباد بھاگیرتھی ندی کے مشرقی کنارے اور کلکتہ کے شمال میں واقع ہے۔ یہ شہر پہلے مقصود آباد کے نام سے مشہور تھا لیکن اس شہر کا موجودہ نام مرشد آباد (مرشد قلی خاں کے نام سے منسوب) ہے۔ جو بنگال کے دیوان اور بعد میں گورنر مقرر ہوئے، اور جنھوں نے ڈھاکہ (موجودہ بنگلہ دیش کی راجدھانی) سے دارالحکومت بدل کر 1713 میں مرشد آباد کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ لیکن 1772 میں ایک بار پھر کلکتہ کو بنگال کا دارالحکومت بنایا گیا، جو 1912 تک پورے برصغیر کا دارالحکومت رہا۔ 1772 سے 1912 تک بے شمار اردو دانشوروں اور شاعروں نے مرشد آباد اور کلکتہ میں قیام کیا۔ مرشد قلی خان، شجاع الدین خاں اور علی وردی خان کی حکومت کے دوران مرشد آباد، عظیم آباد، ہگلی اور ڈھاکہ جیسے مقامات مسلم تہذیب وثقافت اور فارسی شعروادب کے نمایاں مراکز بن گئے۔ مرشد قلی خاں فارسی زبان وادب کے ایک اچھے شاعر تھے اور سرشار تخلص رکھتے تھے۔ محمد فقیہ دردمند (1747) نے علی وردی خان کی سرپرستی میں اردو شاعری کی ابتدا کی۔ نواب سراج الدولہ (1757-1733) نے اردو اور فارسی شعروادب کی سرپرستی کی، قدرت اللہ قدرت اور فرحت اللہ فرحت جیسے شاعران کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر شرف جو اس دور کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے انھیں میر جعفر (1765) کی سرپرستی حاصل تھی۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں بے شمار قیمتی اور قدیم نسخے آج بھی نواب محل کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ مرشد آباد میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں انشاء اللہ خاں انشا نے اردو شاعر وادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے فارسی زبان میں دریائے لطافت کے نام سے اردو گرامر لکھی اس کتاب کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ آج بھی اردو حلقے میں اس کتاب کی اہمیت مسلم ہے۔

18ویں صدی کے اوائل سے ہی ہندوستان اور بیرون ملک سے مختلف نسل ونژادت کے لوگ مختلف مقاصد کے تحت بالخصوص ملازمت اور تجارت کے لیے یہاں آکر بسنے لگے۔ مرشد آباد میں آج بھی مختلف نسل ومذہب کے لوگ بسے ہوئے ہیں۔ شہر کی نو سو مسجدیں اور تین سو مندر اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مرشد آباد میں اس وقت کثیر آبادی تھی نیل اور ریشم کی کاشت اور تانبہ اور کانسہ کی برتن سازی میں اس شہر کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر ایک عظیم تجارتی مرکز تھا۔ یورپ کے تاجروں کی آمد سے یہاں تجارتی کوٹھیاں قائم ہونے لگی تھیں۔ تجارت کے علاوہ ادب ثقافت، مصوری، ہندوستانی کلاسکی موسیقی اور مغل پینٹنگز میں بھی اس شہر کو بڑا عروج حاصل تھا۔

مرشد قلی خاں کی آمد سے شہر مرشد آباد کی ترقی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور اس کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ چونکہ مرشد قلی خان خود ہی ایک تعلیم یافتہ اور مذہبی شخص کے ساتھ ساتھ علم وادب کا اچھا خاصہ ذوق بھی رکھتے تھے اور شاعروں کی قدردانی کرنا بھی جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے صوبے کے ادبا وشعرا مرشد آباد کا رخ کرنے لگے۔ اس زمانے میں سینکڑوں کی تعداد میں دوسری ریاستوں سے ادبا وشعرا تشریف لائے۔ آگے چل کر یہ شہر ایک دبستان کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے، جہاں پر دہلی، لکھنؤ، بھوپال اور عظیم آباد جیسے ادبی دبستانوں سے بے شمار اہل علم اور اہل قلم حضرات تشریف لائے۔ ان ادبا وشعرا کے اہم ناموں میں قدرت، دردمند فقیہ، امانی، دانا، ندیم، ولی، فغاں، ہمدم، ندا، ماشاء اللہ خان مصدر وغیرہ کا نام شامل ہیں۔ ان شعرا کے کلام اور ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے مقامی ادبا وشعرا کو آگے آنے میں مدد ملی اور اردو شاعری بہت تیزی کے ساتھ آگے کی طرف گامزن ہوئی۔ درج بالا شعرا کے علاوہ بھی بہت سارے ایسے شعرا وادبا ہیں جنھوں نے اپنے کلام سے دبستان مرشد آباد کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

بقول ڈاکٹر رضا علی خاں:

> ''نواب علی وردی خان کے بڑے داماد نوازش محمد خان کو بھی جو بنگال کے دیوان تھے، شعروادب کا شستہ مذاق تھا۔ انھوں نے مرزا ظہور علی خلیق کو بادشاہ محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی سے مرشد آباد بلا لیا تھا۔ مرزا ظہور علی اس عہد کے مشہور مرثیہ گو اور مرثیہ خواں گذرے ہیں۔ نواب سراج الدولہ، نواب میر جعفر اور نواب میر قاسم کے عہد حکومت میں مرشد آباد ثقافت وادب کا مشہور مرکز بن گیا تھا۔''

(مرشد آباد: اردو کا ایک قدیم مرکز، ص 28-29، سن 2007)

اس طرح مرشد آباد کی سرزمین بے شمار شعرا اور ادبا اور فنکاروں اور مصوروں سے مالا مال ہوگئی اور مرشد آباد ادب وثقافت کا ایک عظیم مرکز بن گیا اور دبستان اردو کی حیثیت سے اس کی پہچان بن گئی۔

اردو کا چمن لالہ زار ہوگیا اور اردو زبان اتنی پھولی پھلی کہ لوگ بلا تفریق مذہب وملت اردو کو اپنی زبان کہنے پر ناز کرنے لگے۔ صرف یہی نہیں غیر مسلم طبقہ سے بھی اچھے اچھے شعرا وادبا اور اساتذہ فن پیدا ہونے لگے نوابین نے بھی زبان وادب کی سرپرستی میں کوتاہی نہیں کی۔ شہر مرشد آباد میں اردو زبان وادب کی ترقی میں مقامی ادبا وشعرا کے علاوہ بیرونی شعرا وادبا کا کردار بھی نہایت اہم رہا ہے جنھوں نے مرشد آباد کی سرزمین کو فارسی واردو شعروادب سے سرسبز وشاداب کیا۔ درحقیقت ماضی میں مرشد آباد کو بنگال، اڑیسہ اور بہار کی دارالحکومت کے شرف حاصل ہونے کی وجہ سے یہ شہر روز اول سے ہی بیرونی ادبا وشعرا کا مسکن رہا ہے۔

اس کے علاوہ یہ شہر کاروباری، صنعت کاروں، فن کاروں، دست کاروں اور قلم کاروں کے لیے ہمیشہ سے اہم رہا ہے۔ دارالحکومت ہونے کی وجہ سے اس شہر کی روایت رہی ہے کہ روز اول سے ہی اس شہر نے بیرون ملک یا شہر سے آئے باکمال شعرا و ادبا اور فن کاروں کو خوش آمدید کہا ہے۔ بیرون ملک یا شہر سے آئے فنکار و شعرا و ادبا حضرات بھی اس شہر کی ترقی میں پیش پیش رہے۔ فن تعمیر، ادبی وثقافتی معاملات، مذہبی اور شرعی امور میں ان لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج شہر مرشد آباد اردو شعر و ادب کے اہم مراکز میں سے ایک ہے۔

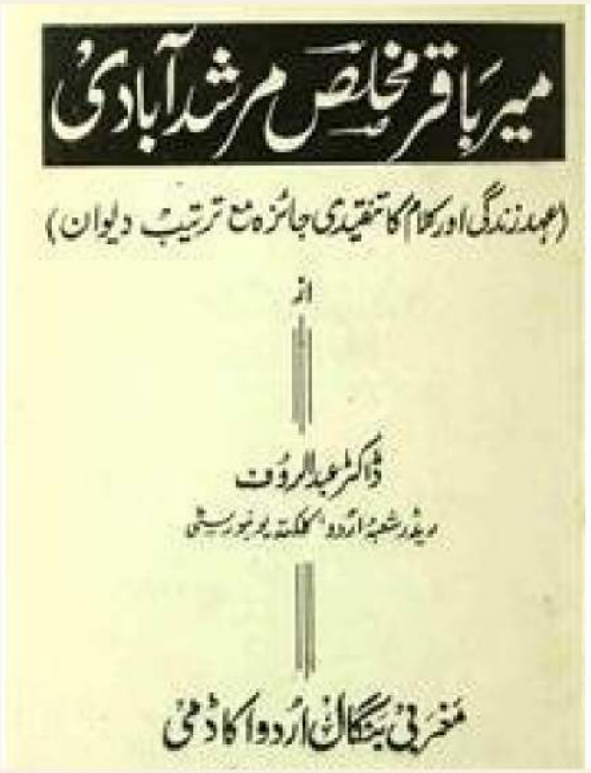

مرشد آباد نوابین کا شہر رہا ہے اور نوابین مرشد آباد نہ صرف شعر و ادب کے اعلیٰ ذوق اور قادرالکلام شاعر ہی نہ تھے بلکہ عالموں، شاعروں اور ادیبوں کے قدردان بھی تھے۔ نوابین کے دربار میں شعر و سخن کی محفلیں سجا کرتی تھیں اور ان مشاعروں میں مقامی اور غیر مقامی شعرا شریک ہوا کرتے تھے۔ نوابین شہر اپنے دربار کے بہت سے باکمال ادبا و شعرا کو ان کی اہلیت و صلاحیت کے مطابق انعامات و خطابات سے بھی نوازا کرتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک مرشد آباد میں شعر و شاعری کا ایک خوشگوار ماحول رہا، لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب نواب نجم الدولہ اور نواب سیف الدولہ کے عہد میں ایک ایسی وبا پھیلی کہ عوام کے ساتھ ساتھ بہت سے شعرا نے بھی مرشد آباد کو خیر باد کہا۔ اس کے بعد جب ماحول سازگار ہوا تو مرشد آباد دوبارہ آباد ہوا اور شعر و سخن کی محفلیں پھر سے آباد ہونے لگیں۔ لیکن یہ ماحول زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا اور تقسیم ملک کے وقت پھر ماحول ناسازگار ہوئے اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور اسی افراتفری کے عالم میں لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کرنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے مرشد آباد کو خیر باد کہا جن میں امرا اور رؤسا کے علاوہ اردو کے مشہور و معروف ادبا و شعرا بھی تھے۔ کئی نامور اور اہم شعرا نے مرشد آباد کو خیر باد کہا اور ملک پاکستان کو اپنا مسکن بنایا یہ بٹوارا مرشد آباد پر بڑا گراں گزرا جس کی داستان اتنی لمبی ہے کہ یہاں اس کا دسواں حصہ بھی بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کی وجہ سے اردو زبان بولنے والے مسلمان اور بے شمار اہل فن نے مسلم ملک پاکستان کو ترجیح دی۔ بس مختصر یہ ہے کہ تقریباً 90 فیصد صاحبان فن نے ترک وطن کیا جن میں زیادہ تر شعرا اور ادبا نے پاکستان یا مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) ہجرت کر لی اور کچھ نے دلی یا لکھنؤ کا رخ کیا۔ مرشد آباد ادبی ہستیوں سے خالی ہو گیا۔ اس کا ادبی فلک تاریک ہو گیا۔ مرشد آباد کے پھلتے پھولتے چمن میں ویرانی چھا گئی۔ نہ وہ شعرا رہے نہ ان کی محفلیں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد جن میں زیادہ تر تعلیم یافتہ افراد تھے ہجرت کر گئے۔ اردو زبان کا شاداب رخت ہمیشہ کے لیے پت جھڑ کے حوالے ہو گیا۔

تقسیم ہند کے بعد شعر و شاعری کے موضوعات میں تبدیلی آئی، چونکہ اب پہلے جیسا نہ ہی ماحول تھا اور نہ ہی دولت کی فراوانی تھی۔ لہٰذا شعرا کے مزاج میں تقسیم کے ماحول کا گہرا اثر پڑا اور شعر و شاعری کے موضوعات میں بہت تیزی کے ساتھ تبدیلی آئی۔ تقسیم ہند سے قبل شعرا امرا و رؤسا اور بادشاہوں و نوابوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے تھے، لیکن اب بدلے ماحول کے ساتھ اردو شاعری کے اسالیب اور موضوعات میں بھی تبدیلی آنی شروع ہو گئی۔ تقسیم ہند کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل جیسے شہر کا اجڑنا، ہجرت، بے روزگاری کے مسائل، ظلم و زیادتی، بے ثباتی دنیا وغیرہ جیسے موضوعات اس وقت کی شعر و شاعری میں جگہ پانے لگے۔

اردو شاعری کی نشو نما میں دبستان مرشد آباد کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اس دبستان کی ترقی کے لیے مقامی شعرا کے ساتھ ساتھ باہری شعرا حضرات کی اہمیت کسی کو بھی انکار نہیں۔ ایسے لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے جن لوگوں نے اس دبستان کی ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔

□□□

Dr. Syeda Jenifar Rezvi
Village: Jublee Tank
Lal Bagh
Distt. Murshidabad-742149 (W.B)

عمران عاکف خان

مابعد جدید اردو افسانے کا نمائندہ نام
نعیمہ جعفری پاشا

اُردو ادب میں جدیدیت کے رجحان کی کوکھ سے جنم لینے والے افسانہ نگاروں نے اس رجحان کے خاتمے کے بعد اسے نئی دَہائیوں میں متعارف کرانے اور اس کی رِوایات کو وسعت دینے کے لیے نئے لب ولہجے اور انداز کا سہارا لے کر انھوں نے افسانے کے کارواں کو آگے بڑھایا۔ تاہم اسی دور میں فکشن میں کچھ عرصے کے لیے ''اینٹی افسانہ'' کی سی کیفیت بھی پیدا ہوگئی۔ جس نے اس کی ہیئت، اس کی صورت، اس کا ہیولہ، اس کا فریم اور فارم سب کچھ بدل دیا اَور تو اَور افسانے میں سے کہانی پن ہی غائب ہوگیا تھا اور اس کی جگہ تجرید و علامت نگاری نے لے لی۔ اس دور کے افسانے کی ہیئت، صورت و شکل یک دم تبدیل ہوئی۔ پتا ہی نہ چلتا تھا کہ مخاطب کنندہ کون ہے، نریشن کس سے کیا جارہا ہے اور ہدف کون ہے۔ ظاہر ہے جب کہانی نہیں ہوگی تو مخاطب کون ہوگا اور تخاطب کس سے کیا جائے گا! بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ باوجود اس کے، اس دَور میں ایسے افسانے لکھے گئے اور انھیں کچھ رسائل نے نہایت اہتمام سے شائع بھی کیا۔ ان میں سے چند افسانے قابلِ ذکر ہیں:

''کمپوزیشن سیریز کے افسانے'' [بلراج مین را] ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم''، ''رونے کی آواز''، ''سرنگ''، اور ''برف پر مکالمہ'' [سریندر پرکاش] ''آخری آدمی''، ''زرد کتا''، ''کایا کلپ'' [انتظار حسین] ''رسائی''، ''بازیافت'' [جوگیندر پال] ''کونپل'' اور ''گائے'' [انور سجاد] ''سواری'' اور ''ایک بوند لہو کی'' [خالدہ اصغر] ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' [غیاث احمد گدی] ''کنواں'' [بلراج کومل] ''کالی بلّی'' [دیوندر اسر] ''ڈاچی والیا'' [کمار پاشی] ''کھوپڑی'' [انور عظیم] ''اسپ کشت مات'' [قمر احسن] ''شکن در شکن''، ''کرسی میں دھنسا ہوا آدمی'' اور ''عقب کا دروازہ'' [حمید سہروردی] ''گدھ اور قحبہ خانہ'' اور ''کالک اور اُجالا'' [اختر یوسف] ''تقیہ بردار'' [اکرام باگ] اور ''گڈ مڈ زمانے'' [م ناگ] وغیرہ۔

افسانے میں علامت اور تجرید کے ثناخواں جواز پیش کرتے ہیں کہ منٹو جیسے لیجنڈری افسانہ نگار نے بھی اپنے آخری دور میں علامت نگاری اور تجرید کو اپنایا ہے، جس کی مثال میں 1956 میں ان کی وفات کے بعد شائع

ہونے والے افسانوی مجموعے 'رتی، ماشہ، تولہ' میں شامل افسانے ''گاف گم''، ''سگریٹ اور فاؤنٹین پن'' اور ''تین میں نہ تیرہ میں'' وغیرہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ جن میں علامت ہے، جن میں تجرید ہے، جن میں کہانی ناپید ہے مگر پھر بھی وہ مقبول ہیں اور انھیں شاہ کار کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ ان کا یہ دعوہ بوجوہ رد ہو جاتا ہے کیوں کہ منٹو کا ہدف وہ تجرید و علامت نگاری نہیں تھی جو 1960 کے بعد اردو ادب میں در آئی تھی۔ منٹو کے یہاں جدیدیت برائے 'جدت' ہے، جدیدیت برائے 'انحراف' نہیں ہے۔ [یہ مباحث وقت اور مستقل تبادلۂ خیال چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جدیدیت اپنے علائم سمیت اپنے ہی پَروں پر اُڑ گئی]

جب افسانے میں یہ چلن طوالت اختیار کرنے لگا تو اس سے عام بے زاری اور پہلو تہی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ قارئین اور مداح سکتے میں آ گئے۔ وہ ہر ایک سے پوچھتے کہ انھیں یہ کیا چیز پروسی جا رہی ہے مگر جارح ناقدوں کے روّیوں کے آگے ان کی پیش نہ جاتی تھی، انھیں اعتراض کی جسارت بھی نہ تھی۔ مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ خواہ وہ فرد کے بجائے 'دَور' ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ وہ 'دَور' آیا اور علامت و تجرید کا یہ سلسلہ تا دیر باقی نہ رہ سکا، افسانے میں پھر اس کے اجزا، اس کے لوازمات، اس کی بنت و تخلیق کے سارے سامان واپس آ گئے، اس میں کہانی پن کا بھی اعادہ ہو گیا۔ کہانی اور قصہ گوئی آ گئی اور وہ نئے زمانے کی آب و ہوا سے آشنا ہونے لگا۔ قاری سے اس کا رشتہ پھر استوار ہونے لگا مزید اس کا اعتبار واپس آ گیا۔ اسے مابعد جدید افسانہ نگاری کا دَور کہا گیا۔ اس دَور کا آغاز 1985 کے بعد ہوا۔

مابعد جدید دور کے افسانہ نگاروں نے علامت، استعارے، تجرید، عجیب و غریب اصطلاحات، رویے، تلازمے، ہیئت، کیفیت اور تکنیک اپنانے کے بجائے راست فطری، کھلے بندوں، بے ساختہ، برجستہ، شفاف، اظہار و عمل یا دوسرے لفظوں میں حقیقت نگاری پر فوکس کیا۔ حقیقت سے مراد حقیقت واقعہ ہے۔ یہی اس کا خصوصی امتیاز بھی ہے اور یہی علامت و شناخت بھی۔ سماجی عوامل سے سروکار، معاشرے کے ہر طبقے، ہر عمر اور ہر عہدے و مقام کے فرد کے نجی، اصولی، فروعی، حقیقی، غیر حقیقی، فطری، غیر فطری، قدرتی، مصنوعی، سائنسی، سیاسی اور عدالتی مسائل و الجھنیں، کرب و بے چینی اور اداسی و مایوسی، نیز فرد کی مجبوری بے بسی، اس کی اُداسی و بے چہرگی، اسی طرح خوشی و کامیابی، فتح و کامرانی، غرض وہ سب کچھ مابعد جدید افسانے میں در آیا جس کی ضرورت بھی تھی یا جو غیر ضروری بھی تھا۔ ترقی پسند افسانے کی مانند اس نے بھی فرد کی فردیت، تنہائی، کرب، بے چینی، محرومی، استبدادیاتی اور حادثاتی کیفیات میں ساتھ دیا ہے۔ اس نے جبر اور استحصالی نظام و رواج پر بھی تنقید کی ہے اور ان جگر سوز رسوم کی پیروی و حمایت کرنے والوں کی ناقدانہ سرکوبی بھی کی اور انھیں ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ اسی لیے تو بعض نقاد مابعد جدید دور کے افسانے کو ترقی پسند افسانے کا دوسرا ایڈیشن کہنے لگے ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مابعد جدید دور کے افسانے کے صحیح خدو خال کی صراحت و شناخت اس عہد کے نقاد اور افسانہ نگاروں کی تحریروں سے کی جائے۔

سید محمد اشرف لکھتے ہیں:

> ..مابعد جدید افسانے کی ایک صفت اور بھی ہے کہ یہ سماجی عوامل سے آنکھیں نہیں چراتا۔ ساتھ ہی ساتھ فرد کی تنہائی سے بھی اسے کوئی بیر نہیں ہے۔ موضوعات کا انتخاب اس کا مسئلہ نہیں اور کسی بھی تکنیک کا استعمال اسے کسی تعصّب میں گرفتار نہیں کرتا۔ دراصل مابعد جدید افسانے کا پورا رویّہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا عکّاس ہے۔

(اردو میں مابعد جدید افسانے کے تشکیلی عناصر، سید محمد اشرف۔ مشمولہ: اوراق لاہور۔ 2000۔ص:252)

محمد حمید شاہد نے مابعد جدید افسانے کی تفہیم اس طرح کرائی ہے:

> آج [مابعد جدید دور] کا افسانہ کسی نظریے اور فلسفے کی تصریح کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں اٹھاتا کہ یہ تو زندگی کی گہری معنویت کا امین ہے۔ یوں نہیں ہے کہ آج کا افسانہ دانش سے تہی ہے، بلکہ یوں ہے کہ یہ عقل اور عقل کی جبریت کی بجائے تمثیلی حکمت کو مانتا ہے۔ یہ باہر کی دنیا کی علت و معلول کو رد کیے بغیر اس کے مقابل کہانی کے اندر کے علت اور معلول کے نظام کو رکھ کر قاری پر انسانی توفیقات کے نئے امکانات رکھ دیتا ہے۔ ان ہی امکانات سے آج کے اردو افسانے کا منظر نامہ بن رہا ہے۔
>
> [مابعد جدید دور کا] افسانے کا بیانیہ تاثراتی اور انشائی ساخت کی بجائے کہانی کی ساخت کو بحال کرتا چلا گیا ہے، اس میں لینڈ اسکیپ ہو یا کردار، واقعہ ہو یا ایک واقعے کا دوسرے واقعات سے جڑ کر معنیاتی امکانات پیدا کرنا، کتھا، داستان، اساطیر یا علامت کو برتنا ہو یا وجود میں اتری ہوئی دہشت سے معاملہ، کہانی کے خارج میں رخنے نہیں پڑتے۔

(اردو افسانے کا منظر نامہ ۔محمد حمید شاہد(خصوصی خطبہ) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔2مارچ2015)

معروف افسانہ نگار اور فکشن نقاد الطاف انجم مابعد جدید افسانے کی موضوعاتی اور تنوعاتی خصوصیات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

> اس [مابعد جدید افسانے] کی بنیادی خصوصیات میں کہانی کی واپسی، بیانیہ[narrative] کی اہمیت پر اصرار، لسانی سطح پر زبان کے خواص پسند عوامی لہجے کا استعمال، موضوعاتی اعتبار سے عالمیت[worldwid] کے بجائے مقامیت [localty] پر توجہ دینا، پلاٹ کی تشکیل و تعمیر، حد درجہ مشکل اور مبہم اصطلاحات سے اجتناب وغیرہ شامل ہیں۔(3)

(نیا اردو افسانہ: مابعد جدید تنقیدی تناظر میں۔الطاف انجم ۔مشمولہ: اردو افسانہ کا سفر (مرتب):ڈاکٹر نجمہ رحمانی، ج:2۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔2015،ص:952)

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کسی بھی طرح کی 'حقیقت' کو 'افسانہ' بنانا اور اسے 'فکشن' کے پیرائے میں ڈھالنا منجملہ ایک مشکل ترین امر تھا، جسے مابعد جدید دور کے افسانہ نگاروں نے چیلنج کے طور پر قبول کیا، پھر حسن خوش اسلوبی سے برتا اور فکشن کی روایت کو مضبوط بناتے چلے گئے۔ فنی لحاظ سے یہ اُن فن کاروں کے لیے تلوار کی دھار پہ چلنے کے مترادف تھا۔ لیکن یہاں اُن کا فن جس سلامت روی اور معنی آفرینی کا ثبوت دیتا گیا وہ مثالی تھا۔انھوں نے اپنے افسانے میں اپنے فن کارانہ و ماہرانہ تجربوں اور نفس انسانی کی غیر معمولی آگہی کی بدولت نہایت خوبی سے کام لیا تھا۔ حقیقت نگاری کو فکشن نما بنانے اور راست بیانیے کا طرز انھوں نے ترقی پسندوں سے سیکھا تھا۔چنانچہ انھوں نے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے طرز پر اردو افسانے کو زمینی حقیقتوں سے روشناس کرایا اور کہانی پن کو بحال کیا جو تجریدیت اور علامت کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر کہیں کھو گیا تھا۔ مابعد جدید افسانہ نگاروں نے زمین سے جڑے لوگوں کو ہی اپنا موضوع اور کردار بنایا تاہم اب یہ موضوعات اور کردار کھیت، کھلیان، گاؤں کے کچے راستوں اور کچے گھروں سے نکل کر چمکتی دمکتی قومی و بین الاقوامی، بالخصوص خلیجی ممالک، ملٹی نیشنل کمپنیوں میں ملازموں، بنک بیلنس کی ریل پیل، لگژری فلیٹس اور روشنیوں سے جگمگاتی اسٹریٹس میں آگئے تھے ۔ وہ کردار و موضوعات یہاں آئے تو تھے سکون اور ترقی کی تلاش میں، جو کچھ دن انھیں ملا بھی، مگر بہت جلد انھیں یہ ترقیاں، یہ تبدیلیاں اور یہ بلندیاں ڈسنے لگیں، یہ اونچی دکانیں بے رنگ اور پھیکی نظر آنے لگیں وہ بھرے پرے شہر میں بھی تنہا تھے۔وہ عالی شان اور بلند و بالا کمپنیوں میں ملازمت کرتے ہوئے کام کی مشین اور گھسے گل پرزے بن گئے تھے۔کمپنی کے اربوں کھربوں کے پروفٹ[profit] میں سے ان کا شیئر معمولی سا اور وہ بھی ایک مدت کے بعد اور اَونر کے احسان خاص کے ساتھ [جن میں غصہ، نفرت، گھڑکیاں وغیرہ شامل ہوتے ہیں]۔صورت حال بہ ایں جا رسید کہ وہ انسانیت کش ایگریمنٹ کے سبب راہ مفر بھی نہیں اختیار کر سکتے تھے، چنانچہ کرب کی لا متناہی جکڑ بندیوں میں جکڑتے چلے گئے۔ان کی دُہائیاں اور چیخ و پُکار ربد حواسی کے عروج پر آ کر کسی سے مدد طلب کر کے یا درد کا درماں بننے کے بجائے خود اُن کے ہی اردگرد رقص کرنے لگیں یا دور جنگل کی آواز محسوس ہونے لگیں۔عالم یہ تھا کہ اب تو انھیں معصوم ماحول اور پاک فضا بھی آرام نہیں دے سکتے تھے۔لہٰذا مسائل کے انبار نے انھیں پوری طرح سے گھیر لیا۔ان کی یہی چیخ، ان کی یہی تنہائی کی پکار، ان کا کرب اور یہی عناصر مختلفہ و متعددہ 'مابعد جدید دور' کے افسانے کا موضوع اور کردار بنے اور یہی مسائل و احوال اس میں راہ پا گئے۔

مابعد جدید دور میں جو افسانہ نگار مابعد جدید اَدبی افق پر نمایاں ہوئے ان میں عابد سہیل، قاضی عبدالستار، رام لعل نیر مسعود، تمکین کاظمی، اقبال مجید، احمد یوسف، عبدالصمد، شوکت حیات، غیاث احمد گدی، طارق چھتاری، ساجد رشید، انور خان، الیاس شوقی، آنند لہر، حسین الحق، کلام حیدری، م۔ ناگ، سلام بن رزاق، جابر حسین، انور قمر، پیغام آفاقی، غضنفر، مظہر امید، مشتاق احمد نوری، مشرف عالم ذوقی، صدیق عالم، خلیل خاور، اسلم جمشید پوری، نعیم اقبال، شموئیل احمد، انیس رفیع، اکرام باگ، ادیب اختر، قیصر عظیم راہی، محمود شاہد، انجم عثمانی، اثر سعید، ضیا کرناٹکی، بلراج کومل، کمار پاشی، شبیر احمد، پرتپال سنگھ بے تاب، احمد ہمیش، شفق، ناصر راہی، غضنفر، قمر احسن، نعیم کوثر وغیرہ کا نام فخر اور احساس شگفتگی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

اس کارواں میں شامل کچھ خواتین بھی قابل ذکر ہیں۔یہ نام وقت کے گزران کے ساتھ ساتھ اردو فکشن میں اعتبار بھی حاصل کر رہے ہیں۔وہ اسما حسب ذیل ہیں:

ذکیہ مشہدی، مسرور جہاں، رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، نجمہ محمود، صبیحہ انور، قمر جہاں، قمر جمالی، عائشہ صدیقی، اشرف جہاں، ڈاکٹر نگار عظیم، نسیم سید، کوثر جمال، ڈاکٹر نگہت نسیم، ڈاکٹر رینو بہل، عذرا نقوی، نیلم احمد بشیر، عصمت آرا، شمیم صادقہ، نزہت نوری، نزہت پروین، سیمیں کرن، سبین علی، فرحین چودھری، شہناز شورو، ثمینہ سید، صادقہ نواب سحر، صبیحہ بیگم، ہاجرہ بانو، جیلانی بانو، دلشاد نسیم، ثروت خان، زنفر کھوکھر، ڈاکٹر نسترن فتیحی، شائستہ فاخری، سلمیٰ صنم، نوشابہ خاتون، غزالہ قمر اعجاز، تسنیم کوثر، عشرت

ناہید، آشا پربھات، کہکشاں انجم، کہکشاں پروین، صبوحی طارق،، غزال ضیغم، تسنیم کوثر، فرحین جمال، سیمیں درّانی، عشرت معین سیما، اسماحسن، مریم ثمر، نصرت شمسی، ناہید اختر، مہرافروز، نصرت طارق ظہیری، عنبریں رحمان، رخسانہ صدیقی، نشاط پروین، نکہت فاروق، انجم قدوائی، شبینہ فرشوری وغیرہ۔ آنے والے وقت میں اس فہرست میں اضافہ بھی ممکن ہے۔

مابعد جدید اردو افسانہ نگاروں کی فہرست خواہ کتنی ہی طویل یا کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، خوش گوار حیران کن بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک انجمن ہے، ہر ایک کا اپنا ایک علاحدہ مقام ہے۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے بھی منظر عام پر آ کر ان کی فکر، ان کے فن، ان کے نظریے اور ان کی فکشن تفہیم کی تبلیغ و ترجمانی میں مصروف ہیں۔ ان میں ہر ایک کا نام و مقام ایک مستقل عنوان رکھتا ہے۔ عالم یہ ہے کہ اول سے دوسرا جدا ہے اور دوسرے سے تیسرے کا مقام الگ۔ چوتھا پانچویں سے مختلف انداز بیاں رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں اور افسانہ نگاری کے فن پر مستقل کتابیں، مضامین، مقالے، دستاویز اور ایم فل و پی ایچ ڈی تک کے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مقالے موجود ہیں۔ اسی طرح موقع بہ موقع سیمینار، سمپوزیم اور علامتی نشستوں کے انعقاد کے ذریعے نئی نسلوں کو روشناس کرایا جاتا رہتا ہے۔ اس لیے مستقل اور جدا جدا طور پر ان کے منتخب افسانوں اور فکشن پر کچھ کہنا اور لکھنا ایک عمومی مضمون میں نہ تو مناسب ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواز بھی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے اپنے بعد کوئی مضبوط و مستحکم روایت قائم نہیں کی اور نہ ہی شعر و سخن کے اسکول کے طرز پر 'فکشن اسکول' کی طرح و بنیاد ڈالی ہے لہٰذا ان کے بعد فکشن / افسانے کا مستقبل اس قدر روشن و تابناک نظر نہیں آتا۔

مابعد جدید دور میں افسانے کا سفر، موجودہ وقت میں چار دہائیوں کی منزلیں طے کر چکا ہے۔ یعنی پانچ نسلیں اس کی آبیاری میں مسلسل مصروف ہیں۔ چھٹی نسل اب تیار ہو رہی ہے اور بزرگوں سے فکشن کے اسرار و رموز سیکھ رہی ہے۔ ان سے جزوی صحت مند اختلاف بھی کر رہی ہے، مباحثے و تبادلے بھی، کہیں کہیں تو پوری طرح ہی بغاوت پر آمادہ ہے اور کہیں کہیں روایات کی پاس داری بھی کرتی نظر آتی ہے۔ یعنی مابعد جدید دور بھی اب زوال آمادہ ہو چلا ہے اور اس کی جگہ غیر محسوس رویے، طرز، زاویے اور نظریات پنپنے لگے ہیں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا بھی مابعد جدید دور کی افسانہ نگار ہیں، جنھیں مابعد جدید اردو افسانے کا 'اسم اعظم' کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کے افسانے متنوع کیفیت، ندرت بیان، موضوع کی ہمہ گیری، عصری موضوعات کی عکاسی، فکری طور پر ہمہ جہتی اور رنگ و آہنگ کے اعتبار سے وسعت لیے ہوئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماجی مسائل کا ذکر اس قدر حساسیت اور فطری انداز میں ہوتا ہے کہ یہ اسلوب [Style] ان کی شناخت بن گیا ہے۔ ان کے اس انفراد اور امتیاز کو ان کے افسانوی مجموعوں: 'ٹوٹا ہوا آدمی'، 'دھوپ کے ساتوں رنگ'، 'حقیقت سے فسانے تک' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا موضوعاتی اور فکری تنوع ان کی دیگر تخلیقات میں بھی نظر آتا ہے۔ جن میں 'مانو یا نہ مانو' [سچی کہانیاں] 'نازشِ جنوں [ناول]' 'پھر کیا ہوا، کچھ اور کہانیاں، آٹھ راتیں سات کہانیاں [ادب اطفال] اس ضمن میں خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے اپنے قلمی سفر کا آغاز محض آٹھ برس کی عمر سے کیا اور چودہ برس کی عمر تک آتے آتے وہ ملک کے بڑے رسائل میں شائع ہونے لگیں۔ معاً انھوں نے شاعری اور دیگر اصناف ادب کی آبیاری کا سلسلہ بھی شروع کر دیا مگر والد صاحب کی ہدایت پر انھوں نے فکشن یعنی افسانہ نگاری کو اپنے بیان اور اظہار کا ذریعہ بنایا۔ چنانچہ آج ان کی شناخت ہمہ جہت ہے تاہم افسانوی شناخت ان سب سے نمایاں ہے۔ آج ان کا شمار اردو فکشن کی قد آور اور نمائندہ نسائی آوازوں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا متعدد روایات کی امین اور شاہد ہیں۔ اردو افسانے کا زرین دور بھی انھوں نے دیکھا ہے اور افسانہ نگاروں کو اس کے برہم گیسو سنوارتے ہوئے بھی۔ فکشن کے مبادیات سے بھی وہ واقف ہیں اور اس کی زمانی و مکانی ضروریات سے بھی انھیں آگہی حاصل ہے۔ ان کی افسانہ نگاری، فکشن شناسی اور اس کی باریکیوں پر نگہ داری کا ذکر کرتے ہوئے معروف ناقد و محقق حقانی القاسمی اپنے مضمون: 'تخلیقی نثر کے فروغ میں جامعہ کا حصہ' میں رقم طراز ہیں:

> نعیمہ جعفری فکشن کے آداب سے آگاہ ہیں، ایجاز و اختصار کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی پر کشش ہے۔ تخیل اور جذبے کی وہ زبان جس میں قاری کے ذہن کو متحرک اور مہمیز کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب دل کش ہے، موضوعی سطح پر انھوں نے اپنی کہانیوں کو تانیثیت میں محصور نہیں رکھا ہے بلکہ معاشرے کے اہم موضوعات کو انھوں نے اپنی تخلیق کا محور بنایا ہے۔ ذات کا کرب، تنہائی، بے حسی، مادیت پرستی ان کے افسانوں کے موضوعات رہے ہیں۔ شائستہ ماحول کی پروردہ نعیمہ جعفری نے اپنی تحریروں میں شستہ [وشگفتہ] زبان استعمال کی ہے۔ ممتاز

ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے ان کی زبان و بیان کی خوبیوں کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''زبان و بیان کے رموز و امکانات پر ان کی نظر گہری ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ نعیمہ کو کہانی کے اسلوب اور آہنگ کی تعمیر کا سلیقہ بھی خوب [آتا] ہے۔''

(تخلیقی نثر کے فروغ میں جامعہ کا حصہ۔حقانی القاسمی۔ادبی میراث [ادبی پورٹل] تاریخ اشاعت: سنیچر، 3 ستمبر 2021)

عصمت خانم چغتائی [لیڈی چنگیزی] کے شہرہ آفاق افسانے ''چوتھی کا جوڑا'' کی توسیع و تسلسل یا نیا روپ کہے جانے والے ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے افسانے ''چوتھی کا ایک اور جوڑا'' سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں؛ جن میں انوکھے علائم اور انسلاکات موجود ہیں، نیا اسلوب اور نیا ڈھنگ ہے نیز 'چوتھی کا جوڑا' کی نئے عہد میں نئے طور سے تفہیم و تعبیر بھی:

کبریٰ کے چہلم کے دن سہ دری میں وہی صاف ستھری جازم بچھائی گئی جسے مرحوم کبریٰ نے اپنے بخار سے تپتے کمزور اور کھردرے ہاتھوں سے دھوکر اس لیے سینتا تھا کہ اس کی بارات کے دن مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے بچھائی جائے گی۔ سہ دری کے چوکے پر جائے نماز بچھائی گئی تھی جس پر محلے کی مسجد سے منگائے گئے پھٹے ہوئے سپارے اور تسبیحیں رکھی تھیں۔ چند ایک بوڑھی عورتیں زور زور سے ہل ہل کر پڑھ رہی تھیں، لڑکی بالیاں تسبیح پر کلمہ پڑھ رہی تھیں۔

بی اماں کا کتر بیونتی دماغ وہیں جا کر پھنسا۔ نہ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ بہت مناسب جوڑ تھا جیسے لال ٹول میں لٹھے کا نیفہ۔ بی اماں نے جھٹ شیخ ناصر علی کو بلوا بھیجا، ساتھ یہ بھی کہلوا دیا کہ نہ آؤ تو میرا مرا منہ دیکھو۔ ناصر علی کبریٰ کی میت پر بھی نہیں آئے تھے، لیکن اس پیغام پر رکتے جھجکتے آ ہی پہنچے۔ بی اماں نے حمیدہ کو شربت لانے کا حکم دیا اور انہیں اندر والی کوٹھری میں لے گئیں۔ حمیدہ نے نیاز کے بچے ہوئے بتاشے گھول کر شربت بنایا اور لے کر چلی تو اندر سے آنے والی آوازیں سن کر سہ دری کے کھمبے کی آڑ میں ہی رک گئی۔ بی اماں ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان ناصر علی کے سامنے گھگھیا رہی تھیں ''ناصر علی تمھیں مشکل کشا کا واسطہ! میری حمیدہ کو اپنا لو ورنہ ہم دونوں ماں بیٹی کا خون ناحق تمھاری گردن پر ہوگا۔'' حمیدہ کے قدم زمین نے پکڑ لیے۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ آنگن میں پھیلے ہوئے دھوپ کے قتلے اسے خون کے سرخ قتلے لگے، جن میں اس کی تمناؤں، آرزوؤں اور بی اماں کی عزت نفس کا خون شامل تھا۔

ناصر علی کی ندامت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی ''آپا آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ خدارا اپنا یہ پاک دوپٹہ میرے گناہ گار پیروں پر سے ہٹالیں۔ میری مجبوری کو سمجھیں۔ میں آپ کی بیٹی کو کوئی خوشی نہ دے سکوں گا۔ قدرت نے مجھے اس جوہر سے محروم رکھا ہے جو عورت کی زندگی میں رنگ بھرتا ہے۔ لوگوں نے مجھ پر بہت الزام لگائے مگر میں خاموش رہا۔ آپ کی بے بسی سے مجبور ہو کر یہ راز آشکار کر رہا ہوں۔''

اسی دم حمیدہ شربت کا گلاس لیے اندر داخل ہوئی ''ناصر علی صاحب مجھے مرد ذات سے نفرت ہے۔ میں نے مرد کا وہ گھنونا روپ دیکھا ہے کہ اگر میری بدنصیبی نے یہ گل نہ کھلایا ہوتا تو وہ خدا کی قسم کبھی مرد کی طرف تھوکتی بھی نہیں۔ مجھے آپ سے کوئی خوشی نہیں چاہیے۔ صرف ایک چھت کا آسرا اور اپنے بچے کو باپ کا نام چاہیے۔ میں اپنی بیوہ اور بدنصیب ماں کے سفید سر پر کالک نہیں دیکھ سکتی۔ آپ مجھے نوکرانی سمجھ کر رکھیے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

آسودہ اور ستم زار لمحات میں، تیز دھوپ یا ناامیدیوں کے موسم میں اگر کہیں کچھ تبدیلی ہو جائے تو کتنا خوش گوار اور بھلا لگتا ہے۔ جیسے موسم کی پہلی بارش، جیسے پودے کا پہلا پھول، جیسے کلی کا تبسم، جیسے بارشوں کے دنوں میں کوئل کا ترانہ، جیسے لامتناہی تاریکیوں کے بعد سورج کی پہلی کرن کا آنا، جیسے صحرا میں بارش ہونا، جیسے بانجھ کے بانجھ پن کے خاتمے کی نوید، جیسے برسوں سے تڑپ رہی سہاگن کے ماہی کی آمد کی اطلاع آئے اور جوں تاریک بدلیوں سے روشن چاند نکل آئے، ایسا ہی رومانی اور رنگ زار احساس، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے یہاں بھی ہے۔ ان کا افسانہ ''دستک'' ان کے اِن ہی احساسات کا ترجمان ہے۔ ''دستک'' ان کی ترجمانی خوبی و کمال کا بھی مظہر ہے اور مغربی رومانیت کو لباس اُردو / ہندستانی عطا کرنے کے ایک ہنر سے بھی عبارت ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں:

''تو تم کل چلے جاؤ گے؟''

''ہاں! مجھے جانا ہی ہوگا۔''

''وہاں جا کر مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟''

''صرف ایک صورت میں بھول سکتا ہوں۔''

''اور وہ کیا ہے؟''

''جب دشمن کی گولی میرے سینے کے پار ہو جائے تو شاید.....لیکن اس سے پہلے یہ ممکن نہیں ہے۔''

''ایسا نہ کہو راج! میری ہر سانس دعا کرتی رہے گی کہ تم سلامت رہو۔ واپس آجاؤ۔''

''مجھے لوٹنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے سجاتا! اگر میں کئی سال تک واپس نہ آسکوں تو کیا تم.....؟''

''نہیں راج! میں مر کر بھی تمھاری ہی رہوں گی۔ میری روح بھی تمھاری واپسی کا انتظار کرے گی۔ جب تم لوٹ کر حویلی میں آؤ گے تو میں تمھارا سواگت کروں گی، تمھیں پھولوں سے لاد دوں گی۔''

تیرہ سال بیت گئے۔

ان تیرہ برسوں میں ہر رات اس نے سجاتا کو خواب میں دیکھا۔

سردی کی اداس راتوں کے تنہا راہی چاند کے چہرے میں وہ اس کی چھبی [شبیہ] تلاش کر رہی ہے۔

گرمی کی دل کش شاموں میں دریا کے کنارے وہ ستارے کے تاروں پر اس کی جدائی کے نغمے چھیڑ رہی ہے۔

بہار کی حسین صبحوں میں مسکراتے پھولوں سے وہ پوچھ رہی ہے۔

''میرا محبوب کب آئے گا۔''

چودہ سال بعد جب راج واپس گھر لوٹا تو اس کے ذہن میں پہلا خیال سجاتا کا تھا، قصبے میں قدم رکھتے ہی اس کے دل نے سب سے پہلے سجاتا کو پکارا، اس کی نگاہوں نے سجاتا کو ڈھونڈا، اس کے کانوں نے سجاتا کی مدھر آواز سننی چاہی۔

گھر پر صرف اس کا وفادار گھوڑا اس کا منتظر تھا۔ اس کا گھوڑا خودرَو گھاس چرتے چرتے آگے نکل گیا تھا۔ راج اس کی طرف بڑھا اور اچھل کر سوار ہو گیا۔ آخری مرتبہ اس نے بلند آواز میں کہا:

''اس سے کہہ دینا میں آیا تھا، لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی روح بھی میرا انتظار کرے گی! لیکن اس نے انتظار نہیں کیا۔ میں جا رہا ہوں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن وہ اپنا وعدہ بھول گئی۔''

خوابوں کے اس کھنڈر میں اس نے اپنی آواز کی بازگشت سنی اور وہ چلا گیا۔

دروازے کے قریب چاندنی میں نہائی ہوئی سیڑھیوں پر ایک 'روح' خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتی رہی، آنسو بہاتی رہی۔

یاس، تمنا، وفا، امنگ، انتظار، کسک، اعتبار، چاہت، جذبات اور ان کی نازکی، سفر، آمد، رخصت، چاندنی، روح، جنگ، فتح، پیپل، پھول کلیاں، شبنم، بھونرے، تتلیاں، دریا، جھیل، ساحل، پہاڑ وغیرہ۔ اس افسانے میں مکمل کائنات سمو دی گئی۔ اس کائنات کا ہر گوشہ خوش نما ہے اور قابل دید ہے۔ کسی عود میں بسی شام کی مانند یہ افسانہ ایسا ہے کہ اسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

تعلیم، سماجی کشمکش، انسان کی بدلتی نفسیات، سماجی اور ذات پات کے بندھن، رہن سہن اور طبقاتی و کلاسکل اسٹیٹس بھی ان کی تحریروں کا حصہ ہیں افسانہ 'تحلیل' میں وہ ان ہی امراض کا پوسٹ مارٹم کرتی ہیں۔ 'کرائے کی کوکھ' آج کی ماڈرن زندگی، کپلس کی لگژریس لائف اور اس میں بغیر جسمانی ملاپ کے کسی ایک جان کا اضافہ کرنے کے لیے کرائے کی کوکھ حاصل کرنا، جیسے واقعات ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے دیگر افسانے مثلاً: 'کفارہ'، 'اف یہ آسمان'، 'بھرم' اور 'زہریلی دھوپ' وغیرہ مختلف سماجی کیفیات اور تاثرات لیے ہوئے ہیں۔ جن میں وہ ایک نئے روپ سروپ میں نظر آتی ہیں۔ کبھی معلم، کبھی ناقد، کبھی مصلح، کبھی نکتہ چیں، کبھی معالج تو کبھی مسیحا و ہمدرد۔ پر لطف بات یہ ہے کہ ان کے یہ سب ہی روپ بھلے لگتے ہیں۔

ان کے مقبول و معروف افسانوں کے انتخاب میں 'اب کے برس'، 'چوتھی کا ایک اور جوڑا'، 'امربیل'، 'خود آگہی'، 'آخر کب تک'، 'شناسا'، 'زہریلی دھوپ'، 'بھرم'، 'بازگر'، 'شیشہ و تیشہ'، 'کرائے کی کوکھ'، 'اُف یہ آسمان'، 'کفارہ'، 'تحلیل'، 'کینچوے'، 'احساس کا مجرم'، 'ٹوٹا ہوا آدمی'، 'وہ'، 'کاک راج'، 'خوب صورت'، 'بدلہ'، 'دستک'، 'داغ دار اجالا' ہیں۔

یہ تمام افسانے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے غماز۔ ان کا طرز جدا، ان کی لَے جدا۔□□□

Imran Akif Khan
Government College
Laxmangarh
Sikar-332311 (Rajasthan)

تبسم ہاشمی

اردو میں مکتوب نگاری کا فن اور روایت

مکتوب یعنی خط عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سطر یا تحریر کے ہیں۔ لیکن عربی میں یہ لفظ اصطلاحی طور پر تحریر کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور مکتوب یا مراسلہ کے معنی میں بھی۔ مکتوبات وہ تحریریں ہیں جن میں مکتوب نگار اپنے خیالات و جذبات کو قلم بند کر کے مکتوب الیہ کو بھیجتا ہے۔ مکتوب الیہ کے معنی ہیں جس کو مکتوب بھیجا گیا ہو۔ یعنی وہ شخص جس کے نام مکتوب لکھا جائے۔ ادبی اصطلاح میں مکتوب نگاری باقاعدہ ایک صنف ہے جس کے اپنے حدود و معیار ہیں اور جس کی اپنی انفرادی ہیئت و تکنیک ہے۔ یہ صنف جب مخصوص رنگ میں ڈھل کر ادب کا پیرایہ اختیار کر لیتی ہے تو مکتوب نگاری کے زمرے میں آجاتی ہے۔

مکتوبات کے دائرے میں وہ تمام موضوعات سمیٹے جاسکتے ہیں جس کا تعلق انسان کے ذہنی ارتقاء اور زندگی کے مختلف گوشوں سے ہوتا ہے۔

مکتوب کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے اور مکتوب نگاری اپنی ادبی شکل میں ان تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے جن کی موجودگی کسی فن پارے کا ضروری جزو قرار دی جاسکتی ہے۔ مصنف جب اپنے مکتوبات میں فنکارانہ انداز سے سیاسی و سماجی، مادی و روحانی تجربوں کو پیش کرتا ہے تو ان تحریروں میں جذبہ و احساس کی لہریں اپنی تخلیقی حسیّت کے ساتھ (Under current) کے طور پر موجود ہوتی ہیں ایسے مکتوب کو فنی مکتوب کہا جاسکتا ہے۔ مکتوب نگاری کی ایک خاص ادبی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں عمومی زندگی اور روزمرہ کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ یہی وہ صنف ہے جس نے عامی اور ادیب کے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم کی ہے مکتوب نگاری ایک ایسی دلکش صنف ہے جو خود لکھنے والے کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور اس کی شخصیت کا ہر رنگ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر

مکتوبات میں انسان اپنے دلی جذبہ واحساس اور خیالات کو کھل کر بیان کرتا ہے۔ جس طرح تمام انسان ایک طرح کے ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہوتے ہیں۔ اسی طرح مکتوب لکھنے والے کی بھی ایک انفرادی شخصیت، ضرور ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مکتوب نگاری کا فن شخصی ہونے کے ساتھ ساتھ شخصیتوں کا فن بھی ہے۔

مکتوب نگاری ایک ایسی صنف ہے کہ سادگی، لطافت، بے ساختگی اس کا خاصا سمجھی جاتی ہیں۔ کیونکہ مکتوب کا مقصد پیغام رسانی ہے۔ لہٰذا وہی مکتوب کامیاب ہوسکتا ہے جس میں بات اس طرح کہی جائے کہ مکتوب الیہ گفتگو کی تمام جزئیات تک کو جان لے۔ چند بے تکلف سیدھے سادے لفظوں پر مشتمل ایک مکتوب بھی بغیر کسی تکلف کے اپنے مدعا کی ترسیل میں کامیاب ہوسکتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی سادگی میں وہ سحر کاری پنہاں ہوتی ہے جس پر ہزاروں رنگینیاں وزیبائیاں، قربان کی جاسکتی ہیں۔ مکتوب کے اسی حسنِ سادہ کی تعریف ڈاکٹر عبدالحق نے ان الفاظ میں کی ہے:

> ''مکتوبات کی یہی سادگی و بے رہائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مکتوبات سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوسکتا۔ مکتوبات میں کاتب، مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے۔''(1) ص:16

ادب میں انھیں مکتوبات کو صنف کی حیثیت سے قبول کیا گیا ہے جن میں فطری گفتگو کا انداز اپنے تمام دلچسپ پہلوؤں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یعنی مکتوب لکھنے والا اپنے مکتوب الیہ سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے اور یہ بھی ممکن ہے جب مکتوب میں غیر ضروری تصنع و بناوٹ کو دخل نہ ہو ادبی مکتوبات کی ایک پہچان یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان میں صاحب تحریر کی گفتگو کے انداز کے ساتھ ساتھ دو کرداروں کے مکالمے کی شان بھی نمایاں ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر لائق توجہ یا قابل تحسین مکتوب کے اندر کوئی مکالمہ بھی لازمی طور پر موجود ہو بلکہ مکالمے سے مراد ہے مکتوب کے اندر بات چیت کا انداز اور ظاہری ملاقات والی گفتگو کی سادگی پائی جائے۔

اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کے قدیم ترین مکتوب کی تحقیق وجستجو کا کام اس لیے بھی زیادہ اہم ہے کہ زبان میں عہد بہ عہد جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ مکتوب ہندوستان کی معاشرت، تہذیبی وثقافتی اقدار اور سیاسی واقتصادی مسائل کے ساتھ زبان کی خوبیاں اور خامیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ بیشتر محققین کے قدیم سے قدیم تر اردو مکاتیب کی دریافت کی سعی سے عام طور پر یہ رجحان ملتا ہے کہ مرزا غالب اردو کے سب سے پہلے مکتوب نگار ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کا قدیم ترین دستیاب شدہ اردو مکتوب 1847 کا ہے اور ان سے پہلے غلام غوث بے خبر کا مکتوب 1820 کا تحریر کردہ ہے۔ رجب علی بیگ سرور کی ایک عرضی 1824 اور 1837 کے مابین ملتی ہے۔ مذکورہ مکتوب نگاروں کے قدیم ترین مکاتیب سے کافی زمانہ قبل یعنی 1822 کا تحریر کردہ نواب والا جاہ کے بیٹے نواب حسام الملک بہادر کا وہ مکتوب ہے جو انھوں نے اپنی بڑی بھاوج صاحبہ کو تحریر کیا تھا۔ مزید برآں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے طیش دہلوی، راسخ عظیم آبادی اور پاس آروی کے مکاتیب کی بھی نشاندہی فرمائی ہے جن کا زمانہ تحریر 1822 سے قبل مانا گیا ہے۔ کافی عرصہ تک مکاتیب اعظم جاہ کے قلمی نسخے سے ماخوذ اس مکتوب کو اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں تقدم حاصل رہا ہے۔ لیکن مرزا قتیل کے مکتوبات کے منظر عام پر آنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ قتیل نے 1817 سے قبل اردو میں مکتوب تحریر کرنے شروع کردیے تھے جن مکاتیب پر تاریخ تحریر درج ہے۔ ان کا موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارواں مکتوب جس کے کاتب افتخار الدین خاں ہیں وہ 1810 کا لکھا ہوا ہے۔ اس طرح قدامت کے لحاظ سے اردو کا پہلا مکتوب 1810 کا تحریر کردہ ثابت ہوتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری میں غالب سے پہلے غلام غوث بے خبر کا نام آتا ہے جنھوں نے غالب سے پہلے مکتوب نگاری کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ ان کے مکاتیب ادبی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ بجا طور پر غالب کے پیش رو کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے اردو مکاتیب کا ایک مجموعہ 1940 میں آگرہ سے ''انشائے بے خبر'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے بعد مرزا غالب کے مکاتیب سامنے آتے ہیں۔ مرزا غالب ایک بڑے مکتوب نگار تھے۔ ان کے مکاتیب سے اردو نثر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ غالب سے پہلے نثر قافیہ وردیف کی بے جا پابندیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ غالب نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے خالص اردوئے معلیٰ اور ٹکسالی زبان میں مکاتیب لکھے۔ قافیہ کی پابندیوں سے آزاد ہوکر سادہ و شگفتہ لب ولہجہ اختیار کیا ان کی کوششوں سے اردو نثر کو سادگی و پرکاری ملی جس سے اردو نثر اس وقت تک محروم تھی۔ غالب کے مکاتیب کے مجموعوں میں ''عودِ ہندی''، ''اردوئے معلیٰ''، خطوط غالب''، ''نادراتِ غالب''

وغیرہ کافی مشہور ہوئے۔ غالب کے مکاتیب میں باتیں کرنے کا انداز اتنا دلچسپ اور انوکھا ہے کہ کہیں بے کیفی محسوس نہیں ہوتی۔ غالب کے مکاتیب کی نثر بڑی سادہ ہے لیکن اس کے باوجود اس میں بڑی دلکشی اور دلآویزی ہے۔ غالب نے اپنے مکاتیب میں بول چال کی زبان استعمال کی ہے ان کے مکاتیب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو آدمی بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے ہوں اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ غالب کے مکاتیب ان کی زندگی اور ان کے عہد کا اشاریہ ہیں ان کے مکاتیب میں غالب کی شخصیت مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہے۔ ان کے مکاتیب سے ان کی پوری زندگی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے وہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، روٹھتے مناتے نظر آتے ہیں۔

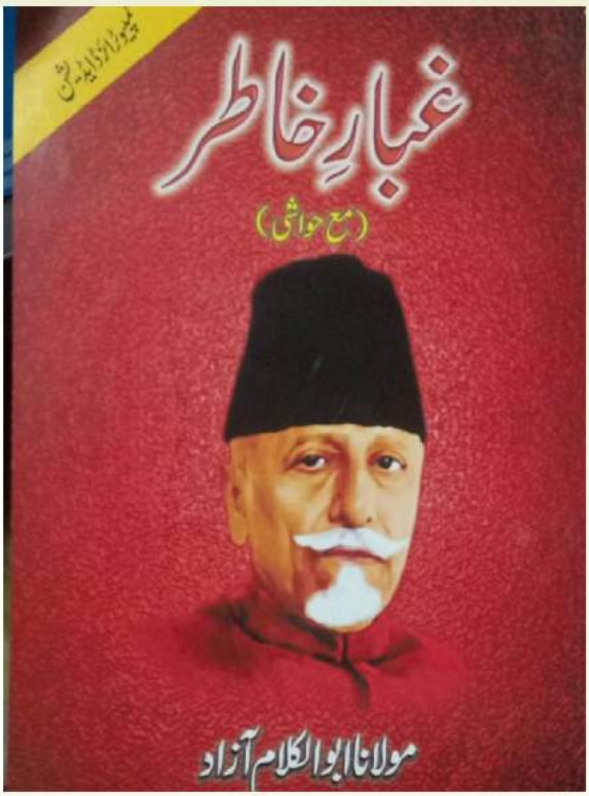

غالب کے بعد اُردو مکتوب نگاری میں جن کا نام سرفہرست ہے وہ سر سیّد احمد خاں ہیں۔ سرسیّد احمد خاں ایک منفرد مکتوب نگار ہیں۔ منفرد اس لحاظ سے کہ عموماً مکاتیب میں ذاتی اور نجی باتیں ہوتی ہیں تعجب ہوتا ہے کہ مکاتیب سرسیّد کے ذخیرے میں سوائے چند ذاتی باتوں کے تمام باتیں جگ بیتی اور جگ کے لیے ہیں۔ ان میں ان کے جوش ایمانی اور حب اسلامی کی کیفیات، ان کی تعلیمی تحریک، سائنٹفک سوسائٹی، اے۔ ایم۔ یو۔ کالج، علمی و تحقیقی کاموں کا تفصیلی ذکر ہے۔ سرسیّد کی شخصیت جن باتوں یا جن خصوصیات و امتیازات سے عبارت ہے ان کے مکاتیب میں نہ صرف اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے بلکہ صراحت کے ساتھ موجود ہیں۔ مثلاً صاف گوئی سرسیّد کا ایک بڑا وصف تھا۔ وہ کسی بات کو پوشیدہ نہ رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنی کمزوریوں کو بھی ظاہر کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ وہ کسی بھی حالت میں نیکی اور سچائی کا ساتھ نہ چھوڑتے اور یہی ان کی عظمت کا راز بھی ہے۔ مکاتیب سرسیّد کے ذریعے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی حالت، تحریک علی گڑھ مدرسۃ العلوم، مسلمانانِ ہند، ریاست حیدر آباد، تہذیب الاخلاق، کالج کے غبن، معاصرین سرسیّد، اردو ہندی نزاع اور جدید اردو شاعری وغیرہ کے متعلق بہت سی تاریخی معلومات ملتی ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی کا نام بھی اردو مکتوب نگاری میں بے حد ضروری ہے۔ حالی نے بھی اردو مکتوب نگاری میں اہم کام انجام دیا ہے۔ حالی کے مکاتیب میں سلاست پائی جاتی ہے۔ ان کے مکاتیب کی حیثیت جام جم کی سی ہے۔ ان کے ذریعے دل کے نہاں خانوں تک رسائی ہوسکتی ہے اور سیرت کے تمام خدوخال نظر آسکتے ہیں۔ حالی کی زندگی، بڑی پاک صاف اور بے ریا تھی اور ان مکاتیب میں اس طرح جھلکتی ہے۔ جیسے آئینہ میں تصویر یا شمشیر میں جوہر۔ ان کے مکاتیب میں وہ درد اور خلوص موجود ہے جو انسانیت کے لیے ضروری ہے۔ حالی کی شخصیت غالب کی طرح پہلودار نہیں تھی اس لیے ان کے آئینے میں ہزار رنگ نہیں ملتے۔ ان کے مکاتیب میں نہ چشمک ہے نہ پندار نہ اُمنگ نہ چھیڑ چھاڑ خلوص کی ایک سیدھی لکیر ہے، دردمندی کی فضا ہے۔ انسانیت کا نغمہ ہے، راست روی اور فرائض کا احساس ہے۔

اقبال کے مکاتیب بھی اردو مکتوب نگاری میں اہمیت کے حامل ہیں اقبال کے مکاتیب سے ان کے نظریۂ فن کے متعلق بیش قیمت مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ جو مکاتیب انھوں نے سیّد سلیمان ندوی اور دوسرے علما کو لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں علم کی کرید اور تحقیق کی لگن تھی وہ عمر بھر سیکھنے اور سمجھنے میں لگے رہے۔ اقبال کے مکاتیب سے ان کی محبت، نیک نفسی اور دردمندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دوسروں کو دکھاتے ہیں۔ اقبال کی زندگی کے بہت سے حالات پردۂ خفا میں ہیں لیکن انھوں نے جو مکاتیب عطیہ بیگم فیضی کو لکھے ہیں ان سے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اقبال کے مکاتیب کے بعد شبلی نعمانی کے مکاتیب ہمارے سامنے

آتے ہیں شبلی کے مکاتیب کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔(1) مکاتیب شبلی۔(2) خطوط شبلی۔شبلی کے مکاتیب میں وہ مکاتیب ہیں جو انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں اور ان میں وہ مکاتیب بھی شامل ہیں جو انھوں نے بمبئی جو عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام لکھے ہیں۔ چھوٹی بہن عطیہ کے نام ان کا پہلا مکتوب 17 فروری 1908 کا لکھا ہوا ہے۔ان کے مکاتیب کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زہرا سے زیادہ انھیں عطیہ سے تعلق خاطر تھا ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

''میں آپ کی بجائے تم کا لفظ لکھوں گا آپ کے لفظ میں بیگانہ پن ہے۔''(2)ص386

اردو مکتوب نگاری میں ایک بڑا نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے مولانا آزاد کے مکاتیب کے دو مجموعے ''غبارِ خاطر'' اور ''کاروانِ خیال'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' کی شان یہ ہے کہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں مولانا کو دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی لیکن ''مخاطبت'' کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دامن گیر ہوئیں کہ وہ وقتاً فوقتاً ''صدیق مکرم'' کے نام مکتوب لکھ کر جمع کرتے رہے اور رہائی کے بعد انھوں نے اس مجموعے کو چھپوا کر نواب صدر یار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا آزاد کے مکاتیب میں سنجیدگی، پختہ مزاجی، انجمن آرائی، نازک مذاقی اور وضع احتیاط ہے جس کو شاعرانہ اسلوبِ بیان کی آمیزش اور قید و بند کے ماحول نے نہایت دلکش بنا دیا ہے۔ مولانا آزاد کے جو مکاتیب ''کاروانِ خیال'' میں چھپے ہیں اور جو آزادی کی حالت میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی افسانہ سرائی اور اعجاز نگاری ہے۔مولانا آزاد نے ذوق حضوری کے لیے بات میں بات اور کہانی سے کہانی پیدا کی ہے اور دل کی گرمی سے محفل کی شمع کو روشن کیا ہے وہ جملوں کو اس طرح سجاتے تھے اور گزری ہوئی باتوں کو کچھ اس انداز سے چھیڑتے تھے کہ ہم نشینی اور ہم زبانی کا لطف پیدا ہو جاتا تھا۔مکتوبات کا اصلی کمال بھی یہی ہے کہ باتوں کا مزہ آجائے اور بُعدِ منزل باقی نہ رہے۔

اردو مکتوب نگاری میں رشید احمد صدیقی کا نام بھی صاحب طرز مکتوب نگاروں میں آتا ہے۔رشید احمد صدیقی کے مکاتیب میں شگفتگی بھی ہے، اور سنجیدگی بھی ،انھوں نے اپنے مکاتیب میں بڑی بے باکی سے حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کم گو انسان تھے لیکن مکاتیب بڑے ذوق و شوق سے لکھتے تھے اور اپنے دل کی تمام تر باتیں مکتوب الیہ کے سامنے کھول کر رکھ دیتے تھے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں مکتوبات لکھے ہیں۔رشید احمد صدیقی کو مکتوب نگاری پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ وہ جگہ جگہ دلچسپ فقروں کا استعمال کرتے رہتے تھے جس کے ذریعے پڑھنے والے کی دلچسپی بنی رہتی تھی۔ ان کے مکاتیب میں ان کا طرز سادہ اور پر جوش ہے،ان کے مکاتیب میں جگہ جگہ سادگی و پرکاری ملے گی۔ان کے مکاتیب میں بذلہ سنجی اور جدت طرازی ہے وہ مکاتیب کے ذریعے فراق میں وصال کے مزے لیتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے مصیبت کا علاج مسکراہٹ سے کیا ہے اور یہی ان مکاتیب کی خاص بات ہے۔رشید احمد صدیقی کیونکہ اپنے مکاتیب کی اشاعت کے حق میں نہیں تھے۔اسی لیے انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''سب سے دلچسپ مکتوب وہ ہوتے ہیں جو تلف کر دیے جائیں یا منظر عام پر نہ آئیں۔''(3)ص472

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت بہت پرانی ہے مکتوب نگاری ایک ایسا فن ہے جس میں مکتوب نگار ساری باتوں کو اپنے مکتوب الیہ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ مرزا غالب، ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور رشید احمد صدیقی جیسے لوگوں نے اردو مکتوب نگاری کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ ہر مکتوب نگار نے اپنے ہی انداز میں مکاتیب لکھے ہیں۔کسی کے مکاتیب صرف ذاتی تسکین کے لیے لکھے گئے تو کسی کے بہت معلوماتی مکتوبات بھی ہیں۔مکتوب نگاری سے تاریخ ادب اور نفسیات کے بہت سے گوشے روشن ہوئے ہیں۔ بعض مکتوب نگاروں کے مکاتیب تو ایسے ہیں کہ ان کے مکاتیب کے ذریعے تاریخ کے خشک واقعات میں بھی جان پڑ گئی ہے۔سبھی مکتوب نگاروں کے مکتوبات ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور ان مکتوبات کے بغیر ہمارے ادب کی تاریخ مکمل نہیں کی جا سکتی ہے۔

کتابیات

1 خطوط نگاری ایک مطالعہ، ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر، نسرین ممتاز بصیر 1995

2 مکتوبات اردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء، خواجہ احمد فاروقی/مرتب:۔فرحت فاطمہ، قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی، فروری 2023

3 غبارِ خاطر، مولانا ابوالکلام آزاد، مکتبہ رشیدیہ لمیٹیڈ (کراچی) 1988

4 خطوطِ رشید احمد صدیقی، لطیف الزماں خاں، مجلس ادبیات مشرق، کراچی 1988

□□□

Tabassum Hashmi

1806, Ahmad Manzil

Kalan Mahal

Darya Ganj

New Delhi-110002

ڈاکٹر آفتاب عالم

بند دریچے کی شاعرہ سائرہ عظیم

اردو ادب میں اصناف سخن کے اعتبار سے ہر صنف میں عظیم سے عظیم تر تخلیق کار اور قلم کار ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ موجودہ عہد میں اگر دیکھا جائے تو شاعرہ اظہار ذات کا ہی وسیلہ نہیں بلکہ اپنے گردو پیش سے رونما ہونے والے حادثات وواقعات کو تخلیقی اکائیوں میں مکمل کرنے کا عمل بھی تخلیق کار کی بصیرتوں، ادراک اور VISION کا معتبر حوالہ ہے۔

سائرہ عظیم قصبہ کاندھلہ ضلع شاملی میں یکم جنوری 1965 کو ولادت پذیر ہوئیں۔ ان کی سسرال قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں ہے۔ خوشی کا مقام یہ ہے کہ ان کے دادا سسر حضرت غلام محمد زائر اور سسر حضرت نیر قریشی گنگوہی اپنے علاقے کے بزرگ وکہنہ مشق شاعر ہوئے۔ ان کے سسر کے کم وبیش نصف درجن شعری مجموعے اور ایک تنقیدی کتاب اردو دنیا میں مقبول ہوئی۔ نیر صاحب مرحوم اردو والوں میں خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی ساس ش، بانو، ادیب (شکیلہ نیر) اردو والوں میں خاصی مشہور ہوئیں۔ ان کے افسانوں پر مضامین کا ایک مجموعہ ''ش، بانو، ادیب ۔۔۔یہیں کہیں ہے'' بہت مقبول ہوا اور ان کے قارئین نے اسے خوب سراہا۔ اس کے ساتھ صبیحہ اطہر نے ان کے افسانوں کا مجموعہ ''بابو جی کی بیٹی'' ترتیب دیا۔ ان کے شوہر نامدار عہد حاضر کے ممتاز شاعر و ناقد عمران عظیم کو تمام اردو دنیا جانتی و پہچانتی ہے۔ یہ رہا سائرہ عظیم کا ادبی تعارف اور پہچان۔

سائرہ عظیم کا ایک شعری مجموعہ ''بند دریچے'' اردو دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''دعا میں یاد رکھنا'' زیر اشاعت ہے اور تنقیدی مجموعہ ''سحر خامہ'' بھی اشاعت کا منتظر ہے۔

سائرہ عظیم کی شاعری ردعمل، انحراف اور احتجاج کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں صرف ہجر ووصال اور حسن وعشق کا ماجرا ہی نہیں بلکہ حالات، مصائب اور مسائل سے نبرد آزما ہونے کا نام شاعری ہے۔

محترمہ اپنے آس پاس کی زندگی سے متاثر ہوتی ہیں وہ جن واقعات، حادثات ومعاملات اور مسائل سے دوچار ہوتی ہیں اسے اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اپنی تخلیقی مہارت سے شعری رنگ میں رنگ دیتی ہیں۔ ان کا انداز سخن بے حد دلکش ہوتا ہے جس سے قاری متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی زبان عام سادہ اور سلیس ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری کے مطالعہ سے ان کے قاری کو کسی بھی ابہام اور ژولیدگی کا احساس درپیش نہیں آتا۔

زیر نظر کتاب کے پیش لفظ ''اعتراف'' سے پتہ چلتا ہے کہ ''آج کا سماجی اور تہذیبی منظر نامہ کیا ہے۔ ہر طرف ایک گھٹن ہے، ایک تھکن اور

گھبراہٹ کی جو فضا ہے، اس نے یقیناً ہمارے ذہنی سکون کو ختم کر دیا ہے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ ہمیں اس صورت حال سے باہر نکلنا ہوگا۔ ہماری نئی نسل شعر و ادب سے اگر دور ہو رہی ہے تو اس صورت حال کی ذمہ داری سے ہم خود کو الگ نہیں کر سکتے کہیں نہ کہیں ہماری تربیت میں کمی ہے۔ ہمیں خود کو بدلنا ہوگا۔ ہمیں گھر میں بھی اردو کے اخبارات و رسائل منگانے ہوں گے۔ ہمیں بچوں کو وقت بھی دینا ہوگا۔ آج سوشل میڈیا اور الکٹرونک میڈیا دو ایسے خاص دشمن ہیں جو ہمارے گھر آنگن کی تہذیب بگاڑ رہے ہیں۔ سوشل میڈیا نے ہمیں قطعی طور پر تباہ کر دیا ہے۔ رات کے دو بجے تک عام طور پر بچے موبائل کھولے رہتے ہیں۔ ماں باپ خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں اپنی جیتی جاگتی تہذیب کو بچانا ہوگا۔ جب اور جہاں سے جاگ جائیں وہیں سویرا ہونا چاہیے۔ یہ زوال ہے ہماری تہذیب کا ہمارے شعر و ادب کا اور ہمارے نئی ادبی منظر نامے کا سماع خراشی کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ جنون میں بک گئی ہوں کیا کیا۔ میں اپنی شاعری اپنے قاری کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ اقدار کے شکست و ریخت کے منظر کی بات پہلے ہی کر چکی ہوں۔ تیز رفتار زندگی میں اردو ادب کی خدمت کرنا بھی فضول لگتا ہے لیکن پرستار شعر و ادب جنون کی کیفیت میں کام کرتے ہیں۔''

سائرہ عظیم غزل سے خاصا لگاؤ رکھتی ہیں۔ انھوں نے شاعری سے عصری صورت حال کی ترجمانی کا اظہار کیا ہے ان کی شاعری میں مثبت انداز فکر کے بہت سارے ثبوت فراہم ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے حوالے سے یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ زبان و بیان اور فنی ارتقا کے تقاضوں کو بخوبی پورا کیا ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت عمیق و گہرا ہے۔ وہ جس چیز پر بھی نگاہ ڈالتی ہے اس کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے اپنی شاعری کا حصہ بناتی ہیں۔ ان کی شعری بصیرت کے انکشاف میں چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

دھوپ سفر پہ نکلے ہیں اب
رستے میں کوئی سایہ کر جائیں

زمین تنگ ہوئی پاؤں اب کہاں رکھیں
سروں پہ اپنے فقط آسمان باقی ہے

بے سروسامانیاں تھیں خوف تھا ہر سمت ہی
گھر میں دیواریں تھیں ساری کوئی دروازہ نہ تھا

کہیں چپ چاپ دن بھی سو رہا تھا
یہاں پر رات کے خیمے بہت تھے

خوب مزے میں گذرا ہے کل دن
رب کو سجدہ کرنا بھول گئی

وہ بھی آہی جائے گا
بیٹھو جب تم آئی ہو

طہارتوں کے عمل کا سلیقہ ہے درکار
ادب سے بیٹھ زمیں پر وضو میں پھول کھلا

چشم حیرت سے دیکھنا کیا
میں نہیں جیسے دوسری ہوں

لیلیٰ ہوتی ہے محلوں میں
صحرا میں مجنوں ہوتا ہے

بدگمانی اس قدر پھیلی کہ سب کچھ ختم تھا
آئینوں کے شہر میں تھے پھول پتھر ہو گئے

دن بھر کی الجھن لے کر گوئی
گھر کا سارا نقشہ بھول گئی

زبان زور کبھی بولنے نہیں دیتا
ہر ایک بات کے معنیٰ بدلتے رہتے ہیں

عالم گیر شہرت یافتہ یوسف خان (دلیپ کمار) ان کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجھے سائرہ عظیم کی غزلیں پسند آئیں۔ وہ عصری زندگی اور روز مرہ کے مسائل کی ترجمانی فنکاری کے ساتھ کرتی ہیں۔ سائرہ عظیم کی شاعری روشن امکانات کی حامل ہے۔ یہ اپنے شعروں کی تازگی اور خوشبو کی وجہ سے بالخصوص نئے ذہنوں کو خاصا متاثر کرتی ہیں۔ اگر موصوفہ اپنے اس تخلیقی سفر کو جاری رکھیں گی تو اپنی شعری فضا کو شادابی بخشیں گی۔ ان کے احساس کی ندرت اور لفظیات کے نئے ڈھانچے کو مزید تازہ کار اور تابندہ ہونے کا موقع مل سکے گا۔ یوسف خان (دلیپ کمار)

انھوں نے شاعری اور نثر میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل میں جو اشعار کہے ہیں وہ بار بار گنگنانے کے قابل ہیں۔ ان کی شاعری میں بلا کی نغمگی اور موسیقیت ہے۔ انھوں نے اشعار میں سہل انداز کو اپنایا ہے۔ کوئی بھی اردو کا عاشق ان کے اشعار کو پڑھ کے یا سن کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کے کچھ اشعار پیش کرتا ہوں جس سے سمجھ جائیں گے کہ شاعر مقصدی ادب کا قائل ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ حوصلہ بھی عجب اس کا ہم نے دیکھا ہے
چراغ جلتا ہواؤں کے پاس چھوڑ گیا

جو ہتھیلی پہ جان رکھتے ہیں
وہ کسی کا بھی ڈر نہیں رکھتے

مرے خوابوں اٹھو اب جاگ جاؤ
مری آنکھوں میں آ کر سو گئے ہو

ان کے آگے سوال رکھنے ہیں
مجھ کو ان سے جواب لینے دو

راز گھر کے عیاں ہے سارے ہی
پھونک ماری ہے کس نے کانوں میں

سائرہ ڈھونڈتی رہی اس کو
کتنی خوشبو تھی زعفرانوں میں

اسے ہر زاویے سے ہم نے دیکھا
کبھی آساں کبھی مشکل ہے دنیا

بالکونی میں آ گیا وہ بھی
میں نے جب سج سنور کے دیکھا ہے

شمع جلتی رہے کسی صورت
میرے گھر کی شبوں کا ساتھی ہو

عجب شکوہ سنایا ہے کسی نے
کری ہے آج پھر فریاد مجھ سے

اس دھوپ کے موسم میں سکوں ہم کو ملے گا
رستے میں کہیں سایۂ دیوار بھی تو ہو

گواہی کون دے گا میرے حق میں
کوئی بھی ہم سفر میرا نہیں ہے

جھگڑا کرتے ہو تم ہم سے
قصہ جوں کا توں ہوتا ہے

ممتاز شاعر و ناقد عشرت ظفر سائرہ عظیم کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

''سائرہ عظیم کو اردو کے شعری ورثہ کا احساس زیادہ ہے وہ خاصے ضبط و احتیاط کے ساتھ اپنے شعری سفر میں رواں دواں ہیں۔ان کی غزلوں میں انفرادیت ہے۔ان کے یہاں تازہ اور چونکا دینے والے شعر کافی تعداد میں موجود ہے۔سائرہ عظیم کا اردو شاعری کا موجودہ سفر نئی راہوں پر گامزن ہے اور منزلیں ہی منزلیں۔نئی منزلیں ان کو پکار رہی ہیں۔مجھے پوری امید ہے کہ اردو شاعری کی آنے والی نسل ان کی طرف گامزن ہوگی ان کی شاعری میں تازہ سوالات کی جھلک ہے اور ڈکشن کی جدیدیت نمایاں ہے۔''

سائرہ عظیم اس بات سے واقف ہیں کہ ضرورت سے زیادہ کرد اریکجا کر دینے سے قاری الجھ کر رہ جاتا ہے۔سائرہ عظیم نے اپنی غزلوں میں انسانی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں عصری حسیّت نمایاں ہے۔وہاں آفاقی موضوعات بھی دہشت گردی کا سفاک اور خوں آشام عفریت پورے انسانی معاشرے کو اپنے خوں بار آتشیں پنجوں میں جکڑے ہوئے ہے۔روزمرہ کے خوں چکاں حالات نے ہر شخص کے دل میں ڈر بھر دیا ہے۔ہر فرد کی عزت و آبرو پر خطرات کے قہر انگیز بادل منڈلا رہے ہیں۔ سائرہ عظیم کو یہ اندوہ ناک مناظر تڑپا دیتے ہیں اور ان کا حساس دل لفظوں کی زباں سے گریہ وزاری کرتا ہے۔

محترمہ کی شاعری میں آسمان پروازی نہیں بلکہ عالم آب وگل کی وہ شاعرہ ہیں جو اپنے گردوپیش کے حالات پر بڑی گہری نظر رکھتی ہیں۔وہ حالات وکوائف کو اپنے اشعار کے سانچے میں آسانی سے ڈھال لیتی ہیں۔ ان کے ذہن میں ٹھہراؤ ہے۔خیالات میں بانکپن ہے اور ان کی شاعری میں سلاست وروانی ہے۔

سائرہ عظیم کو جہاں روایت لفظی اور صنائع وبدائع کے استعمال میں کمال حاصل ہے وہیں وہ با محاورہ، عام فہم اور سلیس زبان وبیاں میں بھی مہارت رکھتی ہیں۔سائرہ عظیم نہ تو مبلغ ہیں نہ واعظ وہ نہ تو مصلح ہیں اور نہ فلسفی مگر وہ اشعار کے پیکر میں سودمند، کارآمد اور حکیمانہ نکتے بیان کرنے میں قدرت رکھتی ہیں کہ کہیں بھی شاعری میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔صاف ستھرے اور رواں دواں اشعار بیاں کرتی ہیں کہ ان اشعار کا جادو ان کے قاری کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔شاعرہ نہایت حساس دردمند اور مخلص ہیں وہ اپنے فکر و ذہن کے دریچوں کو ہمیشہ وا رکھتی ہیں۔وہ اپنے اردگرد کے مسائل و حالات سے ہمیشہ باخبر رہتی ہیں بلکہ ان کا نہایت گہرائی و گیرائی سے مشاہدہ کرتی ہیں جو انھیں اپنے ہمعصروں سے مختلف و منفرد بناتا ہے ان کا اکثر کلام ان کے قارئین و سامعین کے دل و دماغ پر براہ راست اثر کرتا ہے۔

Dr. Aftab Alam
Haji Jamaluddin Library
At +Post: Nauranga
Distt: Gaya -823003 (Bihar)
Mob. No. 9162669393

جبیں نازاں

شاعر ظفر اقبال ظفر

اہل نقد کی نظر میں

اکیسویں صدی میں ظفر اقبال ظفر جیسا صبر وتحمل کا پیکر مستحکم عزم و ارادوں کا شاعر خال خال نظر آتا ہے۔جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے دور کو دیکھا۔جدیدیت، مابعد جدیدیت دور سے گزرتے ہوئے آج عمر کے آخری پڑاؤ پر چمنستانِ اردو ادب میں نمود سبز نامی پہلا شعری مجموعہ، پودا لگایا، جسے ظفر اقبال ظفر کا پہلا اور اب تک کا آخری شعری مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔(ویسے عنقریب ہی نعتیہ شعری مجموعہ کی اشاعت متوقع ہے)

ظفر اقبال ظفر کا اصل نام اقبال حسن ہے۔ان کی پیدائش 9 ستمبر 1940 ریاست اتر پردیش کے ضلع الہٰ آباد کے مردم خیز قصبہ کٹرا میں ہوئی۔ان کے والد نے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر مشہور قصبہ ''فتح پور'' میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور یہ سرزمین ظفر اقبال ظفر کی پہچان بنی۔

ظفر اقبال ظفر نمود سبز کے دیباچے میں اپنی بات کے تحت لکھتے ہیں:

> ''مجھے مطالعے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ناول، افسانے اور تاریخی کتب کے مطالعہ سے کافی دلچسپی تھی، گرمی کی تپتی دوپہر، موسم سرما کی یخ بستہ ہوائیں، جب بچے کھیل کود اور شرارت میں مشغول رہتے۔میں تمام ہنگاموں سے دور گھر کے کسی گوشے میں کتب ورسائل کی گہرائی میں ڈوبا رہتا۔کتابوں سے رشتہ، مشاہدہ کی روشنی، تجربات کی آنچ، حادثات کی تپش اور ادبی محفلوں میں شرکت نے میرے ذہن وادراک کو جلا بخشی، اور فکر وشعور کو گہرائی وگیرائی عطا کی تو میرے اندر تخلیق کی باطنی قوت ابھرنے لگی''۔

یوں تو ظفر اقبال ظفر کے ادبی سفر کا آغاز 1967۔میں افسانہ نگاری سے ہوا اور ایک افسانہ کا مجموعہ ''کالے حرف'' نام سے منظر عام پر آیا۔جسے کافی سراہا گیا، اسے اردو اکادمی اتر پردیش نے انعام سے بھی نوازا، (اپنی بات۔صفحہ 22، نمود سبز)

انہی دنوں ظفر اقبال ظفر کی طبیعت شاعری کی طرف راغب ہوئی، 1982 طبعی میلان نے غزل کہنے پر مجبور کیا۔۔وہ دن ہے اور آج کا دن ظفر اقبال ظفر شعر وشاعری کی زلفوں کے یوں اسیر ہوئے کہ پھر خود کو آزاد نہ کر سکے۔

چالیس سال کا طویل صبر آزما عرصہ اور ایک شعری مجموعہ، ہے نا تعجب خیز اور حیران کن امر۔۔؟ جب کہ پچھلے چند سالوں سے عموماً یہ رجحان اردو دنیا میں عام کہ ایک شاعر دو تین سال شاعری کرنے کے بعد اپنا شعری مجموعہ اردو بازار میں لے آتا ہے۔اور پھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، گویا ہر سال ایک نیا شعری مجموعہ پھینک جاتا ہے الغرض کہ کتابوں کی ڈھیر میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، ابراہیم اشک نے اس روش کو دیکھتے ہوئے فرمایا تھا "غزل

کہنے پر کم از کم دس سال کے لیے پابندی عائد کر دینی چاہیے!
عظمت اللہ خان نے کہا تھا کہ" غزل کی گردن مار دینی چاہیے

بہر حال! ظفر اقبال ظفر نے اس وقت غزل کہنا شروع کی، جب ان کے ایک ہم نام شاعر جن کا تعلق پاکستان سے ہے ان کی شاعری کی شہرت اردو دنیا میں ہو چکی تھی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے:

''محمد حسین آزاد تو کہتے ہیں میر کی شہرت روز افزوں کو دیکھ کر بچارے میر سوز نے اپنا تخلص بدل کر میر سے سوز رکھ لیا تھا، تا کہ میر تقی میر سے التباس نہ ہو، خیر میر سوز اپنے نئے تخلص میں بھی خوب پھولے پھلے۔لیکن ظفر اقبال ظفر نے اپنا پرانا تخلص ترک ہی نہ کیا، اور خود کو منوا کر چھوڑا''

ظفر اقبال ظفر جس یکسوئی، عزم مصمم، جہد مسلسل، پامردی کا مظاہرہ کرتے رہے۔بعض اوقات مضبوط ارادے، مستحکم جذبوں کے حامل شعرا تھوڑی دور چل کر لڑکھڑانے لگتے ہیں۔۔تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، لیکن ظفر اقبال نے مضامین کی جدت کے لیے موضوعات کی کثرت میں وحدت کی تاثیر پیدا کی، اس کے لیے، مستقل مزاجی، وفور شوق، جذبات کی شدت، صبر وتحمل کا اہتمام،، وقیع صلاحیت درکار ہوتی ہے۔۔اتفاق کہ ظفر اقبال ظفر کے یہاں یہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں:

سفر کا سلسلہ آخر کہاں تمام کروں
کہاں چراغ جلاؤں کہاں قیام کروں

ختم اس کی قربتوں کا ہوگیا موسم مگر
ذہن سے خوشبو بدن سے تازگی لپٹی رہی

دے کے شیشے کا گھر بدن پتھر کا گھر مجھ کو دیا
لمحہ لمحہ ٹوٹتے رہنے کا ڈر مجھ کو دیا

تڑپا گیا مجھے کبھی سرشار کر گیا
جھونکا ہوا کا عجب وار کر گیا

صحرا کا سفر تھا تو شجر کیوں نہیں آیا
مانگی تھیں دعائیں تو اثر کیوں نہیں آیا
موم کے لوگ کڑی دھوپ میں آ بیٹھے ہیں
آؤ اب ان کے پگھلنے کا تماشا دیکھیں

رابطہ کیوں رکھوں میں دریا سے
پیاس بجھتی ہے میری صحرا سے

گیان پیٹھ انعام یافتہ معروف شاعر شہر یار ظفر اقبال ظفر کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں:

''ظفر اقبال ظفر ایک خوش گو شاعر ہیں، جن کے لہجے کی نرمی اور شگفتگی ہمیشہ متوجہ کرتی ہے، وہ ان معدودے چند غزل گو شعرا میں ہیں، جو جدید غزل کے تقاضوں سے بخوبی واقف ہیں، بقول فاروقی شعر بنانے

کے فن جانتے ہیں''
ان کے لہجے کی نرمی اور شگفتگی ملاحظہ فرمائیں:

لا مکاں اور مکاں تک سوچوں
ایک ہی بات کہاں تک سوچوں

ستم کے تیر جو ابھرے زمیں سے
لہو ٹپکا ہے موسم کی جبیں سے
نرم مٹی کے بدن سے اٹھ رہی تھیں خوشبوئیں
یا ہوا میں آنے والے موسموں کا شور تھا

تیرے دربار میں جب بات سنی جاتی نہیں
لب کو وا کرنے سے کیا درد کے اظہار سے کیا

منزلیں مجھ سے گریزاں ہیں سفر کیا کرتا
ہم سفر دھوپ تھی تنہا کیا کرتا

عشرت ظفر ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں۔
''ظفر اقبال ظفر نے نئی غزل کو ایک نیا قرینہ دیا ہے، اور ایک نئے سلیقے سے ہم کنار کیا ہے جس طرح جدید غزل گو مظفر حنفی اور غلام مرتضیٰ راہی نے کیا ہے۔''
جدید رنگ و آہنگ کی جھلک درج ذیل اشعار میں دیکھیں:

یہ کیسا سفر ہے کہ ہوا تک نہیں آتی
آہٹ کوئی قدموں کی صدا تک نہیں آتی
سب کنارے کٹ گئے آب رواں کی دھار سے
تشنہ لب ہو کر بھی ہم نکلے نہیں پندار سے

نرم مٹی کے بدن سے اٹھ رہی تھی خوشبوئیں
یا ہوا میں آنے والے موسموں کا شور تھا

سمندروں سے بجھی ہے پیاس کس کی
سرابوں سے گذرنا چاہتا ہوں

شکستہ ہو کے بھی ہم آن بان رکھتے ہیں
بلند اپنے بزرگوں کی شان رکھتے ہیں

کب کسی نکتہ چیں سے الجھا ہے
وہ تو بس ہاں، نہیں سے الجھا ہے

دل بہلانے کا کچھ نہیں ساماں
کیسا جنگل ہے کوئی مور نہیں

سب اپنی شورش پنہاں میں جلنے والے ہیں
پرائی آگ میں کب کوئی خود سے جلتا ہے

علیم اللہ حالی لکھتے ہیں کہ'' ظفر اقبال ظفر کی پہچان اس امر سے متعین ہوتی ہے کہ وہ غزل کے اس رمز کو پہچانتے ہیں جس سے اختصاص اور امتیاز کی خوبیاں قائم ہوتی ہے۔ظفر کے یہاں فکر و احساس کے مثبت حوالے سامنے آتے ہیں جن سے ان کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔''
حقانی القاسمی نے ظفر اقبال ظفر کی شاعری کا اردو کی مشہور و معروف شعرا میر و غالب، رسوا، سودا، مصحفی، شاہ نصیر، ثاقب لکھنوی، جلیل مانک پوری وزیر آغا، احسان دانش، انشا، زیب غوری عبید اللہ علیم، اطہر نفیس، احمد مشتاق یگانہ چنگیزی، شہاب جعفری، کمار پاشی، منیر نیازی، ناصر کاظمی، شکیب جلالی، عزیز قیسی، فانی، عدیم ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی، شہر یار، ندا فاضلی، محمود ایاز وغیرہ وغیرہ سے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''انھیں شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اور احساس و اسلوب کی شائستگی کا ہنر بھی ۔۔۔ موضوعات کی عمومیت بھی ان کے انفرادی اظہار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی ، مطالعاتی وسعت، طویل تخلیقی ممارست اور ریاضت نے ان کے اندر فکری فنی پختگی پیدا کر دی ہے۔ ان کے شعروں میں کوئی سقم اور شکستگی نہیں ہے۔ وہ شاعری کے جمالیاتی معیارات اور فنی لوازمات کا پورا خیال رکھتے ہیں ۔ ان کے یہاں جہاں خیال و الفاظ کی خوبصورتی، قوت اور روشنی ہے، وہیں تکنیکی عمدگی، موسیقیت، اور اصلیت جیسی خوبیاں بھی ان کی شاعری میں موجود ہیں۔۔''

یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب نے انھیں "سمندر، صحرا، سراب، کا شاعر" قرار دیا ہے۔
عاصم شہنواز شبلی تحریر کرتے ہیں:

''ان کی شاعری میں موضوعات و اسلوب ہر دو سطح پر تنوع وتازگی کا احساس ہوتا ہے،ان کے یہاں تراکیب لفظی میں بھی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ جو ظاہر ہے برسوں کی تخلیقی ریاضت کے بعد ہی کسی شاعر کا نصیب بنتا ہے۔یہی نہیں ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ہم موجودہ عہد کے انسان کو درپیش مسائل و مصائب کی تصویریں بھی دیکھ سکتے ہیں۔''

(ظفر اقبال ظفر انسانی اعلیٰ اقدار کا شاعر،مضمون نگار:۔عاصم شہنواز شبلی،سہ ماہی رنگ،دھنباد)

کیسا موسم ہے کہیں رنگ تمنا ہی نہیں
سبز و شاداب کسی شاخ پہ پتہ ہی نہیں

ہوا کا شور سننا چاہتا ہوں
خلا سے اپنا رستہ چاہتا ہوں

جو مرے قتل پہ مامور ہوا
اپنے ہی زخموں سے وہ چور ہوا

عجب طلسم سفر ہے کہ پاؤں تھکتے نہیں
جو چل پڑے ہیں تو سائے بھی ٹھہرے نہیں
ہمارے گھر بھی کھلتے ہیں رنگ رنگ کے پھول
ہمارے گھر کے در و بام کیوں مہکتے نہیں

کہوں کیسے میں چہرہ آدمی کا ہر اک چہرہ ہے نوحہ زندگی کا

سلیم احمد اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں" ظفر اقبال ظفر کی شاعری کئی جہتوں میں منعکس ہوتی ہے وہ کلاسیکی شاعری کی تمام تر روایات اور ضابطوں کی پاسداری کرتے ہوئے نئے مضامین اور نئی تراکیب اور اسلوب میں انوکھے پن کی تلاش کے طرفدار نظر آتے ہیں۔ وہیں سخت مشکل حالات میں بھی اپنے مثبت رویے کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ،وہ جدیدیت کے حامی تو ہیں مگر جدیدیت کے نام پر لایعنیت شاعری سے گریز کرتے ہیں مزید آگے لکھتے ہیں:

''ظفر کی ایک بات مجھے اچھی لگی کہ انھوں نے ذاتی طور پر بھی اپنی زندگی میں ایک مدت تک مسائل ومصائب سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اپنی محرومی نا آسودگیوں کو اپنی شاعری کا منفی پہلو نہیں بنایا۔وہ زخموں سے روشنی کشید کر کے اپنی تاریک راہوں کو منور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور کامیاب بھی رہے ہیں۔''

(ظفر اقبال ظفر کا فکری اور شعوری نظام :۔سلیم احمد انصاری)

علی احمد فاطمی ظفر اقبال ظفر کی شاعری کو زندگی کے وسیع کینوس میں پرکھتے ہوئے مستقبل کی عظیم شاعری کی صف میں جانچنا چاہتے ہیں:

''ظفر اقبال ظفر کے یہاں نظریاتی وابستگی کا اظہار کم ملتا ہے۔لیکن سپردگی سے جذبات بہر حال نظر آتے ہیں،لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ کبھی محض جذباتی سپردگی کا سفر دور تک نہیں جاتا،اس لیے کبھی جدید نظریہ کی مایوسی چھلکتی ہے،کبھی مابعد جدیدیت کے تمام مفروضات سے باخبر تو ہیں لیکن بے اثر بھی''

آگے لکھتے ہیں ظفر کے یہاں اس طرح کی پختہ اور بالیدہ اشعار اور بھی ہیں،جن میں ظفر کی فکر وفن دونوں کا برملا اور بین اظہار ہوا ہے۔اور جن کی وجہ سے اپنے عہد کے شعرا میں اپنی اہم شناخت رکھتے ہیں۔

علی احمد فاطمی پھر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ اہم شناخت،اور غزل کی مقبولیت عظیم شاعری کا معیار نہیں بنتی۔ بلکہ عظیم شاعری وہ ہوتی ہے کہ جو ہر عہد کے مزاجی خاکے میں شاعری فٹ ہو جائے!

''لیکن آگے کے سفر میں اساسی فکر کیا ہوگی،یہ ظفر کو خود طے کرنا ہے۔ہر بڑا شاعر بہر حال اسلوب سے اپنی پہچان بناتا ہے۔محض اسلوب شاعری اسے منفرد تو کر سکتی ہے۔عظیم نہیں،یہ نمود سبز کس کشت فکر پر جا کر قیام کرے گی ،اور شاعری کی ارتقائی فصل کس نوعیت کی ہوگی یہ بھی ظفر کو طے کرنا ہے۔''

(سہ ماہی عالمی فلک،اپریل تا جون 2021،صفحہ نمبر 169 تا 172)

ہر اک نگاہ کو حیرت میں ڈال دیتا ہوں
زمیں کی تہہ سے میں سورج نکال دیتا ہوں

میں امید کرتی ہوں کہ ظفر اقبال ظفر یوں ہی زمین کی تہہ سے سورج نکالتے رہیں گے اور ناقدین ادب کو حیرت میں ڈالتے رہیں گے۔

□□□

Jabeen Nazan
J 23,Near Abdullah Masjid
Gali,no,12,
Ramesh Park, Laxmi Nagar
New Delhi-110092

سفینہ خاتون

جہانِ نسواں

اردو تحقیق کی روایت

ادب سماج کا وہ آئینہ ہے جس میں بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ رونما ہونے والے حادثات و واقعات کے تحت انسانی جذبات و محسوسات الفاظ کے ذریعہ منعکس و رونما ہوتے ہیں۔ گردش لیل و نہار، مرور ایام اور تغیرات زمانہ کے ساتھ یہی الفاظ پہلے بولی اور پھر زبان کی شکل اختیار کرتے ہیں اور زبان کی صورت و ہیئت میں یہی الفاظ و بولیاں مختلف ادوار میں اپنے سماج و معاشرہ اور وقتی تقاضوں کا ذخیرہ و نمونہ رکھتے ہیں۔ اسی زبان کے ذریعہ بنی نوع بشر کے جذبات و محسوسات کا مہذبانہ اظہار تخلیقی صورت میں ادب کہلاتا ہے۔ اس کی دو بڑی صورتیں ہیں، ایک نثری صورت اور دوسری شعری صورت تخلیق بذات خود بہت پیچیدہ محنت طلب اور جاں فرسا عمل۔ جب تخلیق کا ایک بڑا سرمایہ و ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے تب تحقیق اور تنقید کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

تخلیق کی خوبیوں اور خامیوں کو باریک بینی و جانفشانی سے اجاگر کرنا اور اس پر اپنی رائے دینا تنقید کا مقصد ہے جب کہ تخلیق میں پیش کردہ حالات و واقعات کسی حد تک تاریخی شواہد و حقائق سے مناسبت رکھتے ہیں اور یہ کافی حد تک سچائی سے منسلک و مربوط ہوتے ہیں، اس کی معمولات فراہم کرنا محقق کے ذمہ ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق در اصل تلاش و جستجو اور چھان بین کے حوالے سے حقائق کی بازیافت اور اس کی تصدیق و تہذیب سے عبارت ہے۔ تنقید انہی حقائق و براہین اور نتائج سے نہ صرف مباحث کرتی ہے بلکہ اپنی رائے بھی ثبت کرتی ہے۔ بہر حال یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ روز ازل سے کسی چیز کی اصلیت و اہمیت کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اس کی یہی سعی تحقیق کہلاتی ہے۔ تحقیق کوئی جدید علم نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق قدیم انسانی زندگی سے بہت گہرا اور مربوط و مستحکم ہے۔ اس کی ابتدا و آغاز کا مسئلہ بھی انسان کی ابتدا و شروعات کے ساتھ اس طرح وابستہ و منسلک ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تہذیب و تمدن اور ثقافت کے ارتقائی سفر میں اس کی حیثیت ایک رہنما و رہبر کی رہی ہے۔ یہی وہ پہلی طاقت و قوت ہے جو ارتقائی سفر کو جاری رکھنے کے لیے نسل انسانی اور بنی نوع بشر کو مجبور کرتی رہتی ہے۔ غرض یہ کہ قدیم قبائلی انسان ہو یا آج کے مشینی دور کے جدید لوگ تحقیق کا عمل مختلف صورتوں اور ہیئتوں میں جاری اور سرگردہ رہا ہے۔ مثلاً عہد قدیم کے قبائلی لوگ مختلف مظاہر فطرت مثلاً سورج، چاند، ستارے، بارش، سیلاب، ہوا، زلزلہ، دن اور رات وغیرہ کے بارے میں جاننے کی للک و لگن رکھتے تھے اور انھوں نے اپنی فہم و فراست کے مطابق یہ طے کیا کہ سورج، چاند وغیرہ غیر معمولی قوت کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کی پرستش و پوجا کرنی چاہیے۔ اس طرح انھوں نے مظاہر قدرت کی عبادت شروع کی۔ رفتہ رفتہ ان کی

تفتیش وتحقیق نے یہ واضح کیا کہ ہر وہ چیز جو غیر معمولی قوت رکھتی ہو پوجنے اور پرستش کے قابل ہے اور ساتھ ہی ان چیزوں سے ڈر کر اور محتاط رہنا چاہیے تاکہ کہیں وہ تباہ وبرباد نہ کردیں۔

ان کی یہ تفتیش وتحقیق آج بھی من وعن جاری وساری ہے۔صرف انداز اور طریقۂ کار جداگانہ ہے۔آج کا انسان اس بات کی کھوج اور تفتیش کر رہا ہے کہ انسانی جسم کے اندر روح وجان کیسے ڈالی جاتی ہے؟ جو ایک مقررہ ومتعینہ وقت میں جسم فانی سے پرواز کر جاتی ہے اور انسان بے جان و مردہ ہو جاتا ہے۔دل کے اندر دھڑکن وحرکت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ جو زندگی کی بقا کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔جب یہ دھڑکن اور حرکت قلب بند ہو جاتی ہے تو آدمی مردہ قرار دیا جاتا ہے۔یہی تفتیش، تلاش جستجو، چھان بین کو اردو اصطلاح میں تحقیق کہتے ہیں۔اگر تحقیق کا عمل متحرک وجاری نہ رہے تو زندگی کی سرگرمیاں اور بھاگ دوڑ یکسر معدوم وناپید ہو جائیں گی اور ہر کوئی جمود وتعطل کا شکار ہو جائے گا۔یہ تحقیق ہی ہے جو حرکت وہیجان کے لیے مجبور کرتی ہے اور آدمی سدا سرگرم عمل رہتا ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب وموزوں ہوگا کہ ایک زندہ معاشرے وسماج کی بنیادی ضرورت تحقیق ہے۔

اردو اصطلاح میں تحقیق ایک نئی حقیقت وبرہان کی تلاش وجستجو کی عقلی اور علمی سعی وکوشش کا نام ہے۔یہ انسانی فکر وذہن کے دریچوں کو کھولتا ہے، اور میدان عمل کی دنیا میں ہماہمی پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں نئے نئے واقعات کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔تحقیق جس طرح سماجی، معاشرتی اور معاشی مسائل کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے اسی طرح ادب، آرٹ اور انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے مسائل پر بھی غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔تحقیق وجستجو کے ذریعہ ی روح، ذہن اور مادہ کی مختلف شکلوں تک ہماری رسائی ممکن ہوتی ہے۔ہم محض جذبوں کے ساتھ زندہ نہیں رہتے بلکہ ہر قوم پر ہماری دانشوری وعقل مندی ہماری رہنمائی کرتی ہے اور یہ دانشوری ورہنمائی تحقیق کے دامن سے اس طرح لپٹی اور وابستہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جدا نہیں کر سکتے۔

تحقیق کا سب سے دلچسپ اور اہم پہلو یہ ہوتا ہے کہ وہ جہاں بہت سارے مسائل کو حل کرتی ہے اور حیرت انگیز کارنامے وانکشافات کا سبب بنتی ہے، وہیں اہم سوالات بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے اور اپنی مخصوص تکنیک واصول کے ذریعہ ان کی جستجو وتلاش کرتی ہے۔ان کا تجزیہ تحلیل کرتی ہے اور فیصلہ حکم صادر کرتی ہے۔اسکالر ہمیشہ کچھ غور وفکر کرتا رہتا ہے، اس کے بعد جستجو کرتا ہے۔حقیقتوں کا تجزیہ کرتا ہے، اسی لیے تحقیق کو حق کی تلاش وجستجو کہنا بے جا نہیں ہے کیوں کہ انسان کا ذہن ودماغ فطری اعتبار سے خود بخود کسی حقیقت وسچائی کی دریافت نہیں کرتا بلکہ سچ کی تلاش کا مسئلہ بنی نوع انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ ریاضت دار اور امانت دار ہے۔اس دیانت داری کے ساتھ مقصد کا خلوص اپنی جگہ پوشیدہ رہتا ہے، اس کے بعد ذہن سوچنے اور عمل کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔اس غور وخوض وتشکر کے دوران اسکالر کی ذہنی اور دماغی تربیت اور ورزش شروع ہو جاتی ہے اور اسی غور وفکر اور تدبر کا نام تحقیق ہے۔یہ غور وفکر کسی ایک فرد کی بھی ہو سکتی ہے اور پوری جماعت کی بھی۔سائنس اور سماجی سائنس میں تحقیق کی نوعیت عام طور سے جماعتی ہوتی ہے۔ادب اور آرٹ میں بھی جماعتی حیثیت برقرار رہ سکتی ہے لیکن عام طور سے ادب وآرٹ میں تحقیق کی دنیا ایک فرد واحد کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔بہر حال تحقیق کی نوعیت جماعتی ہو یا انفرادی، اس کی منزل اور راہ ایک ہی ہے۔اس کا کام سچ کو جھوٹ سے صحیح کو غلط سے جدا کر کے اصل حقیقت کو دریافت کرنا ہے۔اس سلسلے میں گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو کی ادبی تحقیق کا تعلق ہے، اس کا بھی یہی مقصد ہے کہ جن مصنفین، جن ادوار، جن علاقوں، جن کتابوں اور متفرق تخلیقات کے بارے میں کم معلوم ہے، ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائیں۔ان کے بارے میں اب تک جو بھی معلوم ہے، اس کی جانچ پڑتال کر کے اس کی غلط بیانیوں کی تصحیح کر دی جائے تاکہ غلط مواد کی بنا پر غلط فیصلے صادر نہ کر دیے جائیں۔''

(تحقیق کا فن، گیان چند جین۔ص 7)

تذکرہ نگاری کے فن کی خصوصیات نے تحقیق کی روایت کو فروغ وترقی سے ہمکنار کیا اور تحقیق کے میدان میں نامور اور مشہور ومعروف محقق ہمارے سامنے آئے۔ملک گیر پیمانے پر جائزہ لیا جائے تو اردو زبان میں تنقید کی بہ نسبت تحقیق زیادہ احساس توازن اور ہمہ ہمی کے ساتھ اپنی زمین ہموار کر کے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی ہے۔اردو تحقیق نے انگریزی طریقۂ تحقیق سے بھی کافی اثرات قبول کیے۔اس نے مغرب سے حقائق کی معروضی جانچ پرکھ، منطقی استدلال اور سائنسی تجزیہ کے آلات مستعار لیے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مشرق کے وہ اصول تحقیق بھی پیش نظر رہے ہیں جن کا اعلیٰ ترین اور بہترین نمونہ احادیث کی تدوین وتدقیق میں نظر آتا ہے اور اردو کے اولین محقق سرسید، حالی، شبلی اور آزاد کی نگاہوں سے یہ اوجھل نہیں ہوں گے۔اردو تحقیق کی روایت میں ایسے مستند ومعتبر عالم اور محقق نظر آتے ہیں جن کا موازنہ ومقابلہ وثوق واعتبار کے ساتھ دنیا کی ترقی

یافتہ زبانوں کے محققوں کے ساتھ بلا مبالغہ کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ہمارے اردو تحقیقی سرمایہ کی عمر بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اردو ادبی تحقیق کے میدان میں سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، سید سلیمان ندوی، حافظ محمود شیرانی، مولوی عبدالحق محی الدین قادری زور، نصیر الدین ہاشمی، مسعود حسن رضوی ادیب، امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام، خواجہ احمد فاروقی، نذیر احمد، رشید حسن خان اور تنویر احمد علوی وغیرہ کے نام بہت ہی اہم اور معتبر و مستند ہیں۔ ان کے علاوہ غلام رسول مہر، عندلیب شادانی، جمیل جالبی، عبدالستار صدیقی، عبدالستار دلوی، سید عبداللہ، خلیق انجم اور گیان چند جین کے نام بھی کم اہمیت کے متحمل نہیں ہیں بلکہ ان کا نام اردو تحقیق میں اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ مذکورہ محققین نے اردو تحقیق کے باب میں بے مثال اور نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ اپنی محنت و کاوش اور لگن سے اردو تحقیق کے باغ میں ثمر دار شجر لگا دیا ہے۔ انھوں نے تحقیق و تدوین اور تدقیق کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ان محققین کی کاوشوں اور تحقیق و جستجو سے بہت سے مسخ شدہ اور گم شدہ متون چھان بین کے بعد صحیح صورت میں منظر عام پر آئے۔

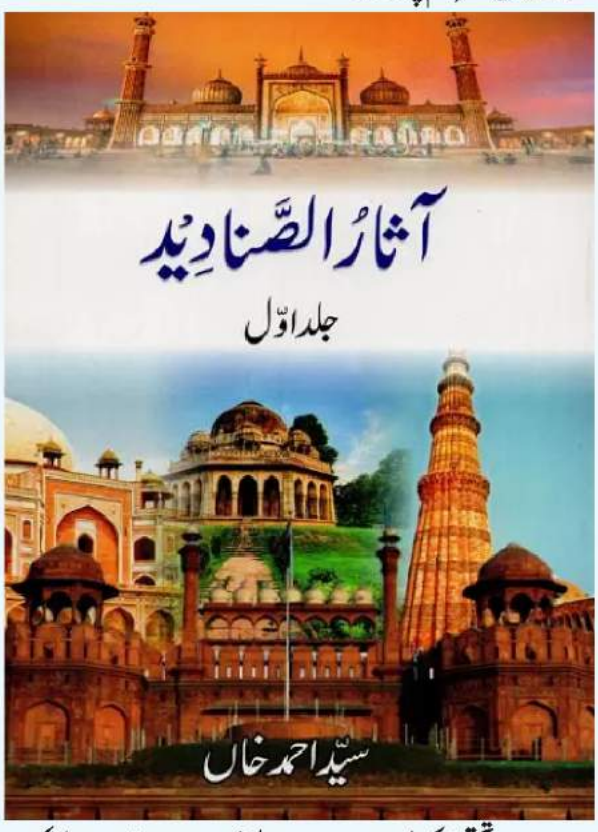

اردو تحقیق کی طرف سب سے پہلے جس نے اپنی توجہ مبذول کی وہ ہیں سرسید احمد خاں۔ ان سے پہلے بھی توجہ دی گئی تھی لیکن باضابطہ طور پر سرسید نے اس کو اپنے پیش نظر رکھا۔ انھوں نے قدیم اور مسخ شدہ متون کی ترتیب و تدوین کر کے اردو تحقیق کی روایت کو فروغ دیا۔ ''جام جم''، ''آثار الصنادید''، ''خطبات احمدیہ'' وغیرہ سرسید احمد خاں کی ایسی تصانیف ہیں جن میں تحقیقی روایات کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ یہ کتابیں تحقیقی نوعیت سے بہت ہی اہم ہیں۔ تاریخ فیروز شاہی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری وغیرہ کے متون کی انھوں نے صحیح و ترتیب اور تدوین کر کے اردو محققین کے لیے راہ ہموار کی۔ یہیں سے باضابطہ طور پر اردو تحقیق اور ترتیب و تدوین کی ابتداء ہوتی ہے۔ سرسید احمد خاں نے تحقیق و جستجو کو اپنی زندگی کا اہم جز بنالیا تھا اور یہی شوق و ذوق ان کو اردو تحقیق کے بانیوں میں زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اردو کے عناصر خمسہ میں محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے محققین میں نہیں ہوتا ہے بلکہ انھیں لسانیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ''سخن دان فارس'' اور ''آب حیات'' میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں تحقیقی اسالیب کے بجائے افسانوی اسالیب برتا ہے۔ عہد حاضر میں تمام اصناف کے لیے الگ الگ اسالیب و اصول مروج ہیں۔ محمد حسین آزاد کے زمانے میں تحقیق کے لیے کوئی خاص اسلوب وضابطہ نہیں تھا نہ ہی باقاعدہ تحقیق کا آغاز ہوا تھا اور نہ ہی اصول و ضوابط متعین تھے۔ یہی سبب ہے کہ انھیں نے جو اسلوب زیادہ اچھا لگا اس کو تحقیق و تنقید میں اپنایا اور استعمال کیا۔ آب حیات میں اردو تحقیق کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھوں نے اردو میں تحقیق کی راہ کو ہموار کرنے کا کام کیا اور لوگوں کی توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ آب حیات نے ناقدین و محققین کو اپنی جانب مائل کیا اور ایک نئی راہ دکھائی۔ دیوان ذوق کی ترتیب کے علاوہ بھی محمد حسین آزاد کا اردو زبان و ادب میں اہم کام ہے۔

اردو نظم و نثر کی غیر معمولی خدمت کرنے والے خواجہ الطاف حسین حالی کو جدید اردو ادب کا معمار و بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ انھوں نے سب سے پہلے زندگی اور ادب کے باہمی رشتے و تعلق کو اپنی دانش مندی و شعوری کاوشوں سے آشکار کیا ہے۔ انھوں نے کئی سوانحی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی سوانحی کتابوں میں ''حیات جاوید''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات سعدی'' وغیرہ سرفہرست اور بلند مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ ان کتابوں میں حالی نے حالات کی صحت و درستی صحت و درستگی پر اپنا زور صرف کیا ہے۔

حقائق و براہین اور ان کے ماخذ کی تلاش و جستجو اور چھان بین کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی تحقیقی کوشش اور محنت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ حالی نے واقعات و حالات کو ان کی صحیح شکل و صورت میں پیش کرنے

کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور یہ کوشش و لگن ان کی دیگر تصنیفات میں بھی نمایاں ہیں۔ان کی تحقیق و جستجو میں کچھ خامیاں و نقائص بھی در آئی ہیں۔ان سب کے باوجود حالی نے سچائی کی تلاش و جستجو اور حقائق کی تہہ تک جا کر حالات و واقعات کو یکجا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور ان کی یہی کوشش و کاوش اور لگن ان کی تحقیقی دلچسپی و شغف کی نشان دہی کرتی ہے اور ہمارے لیے حقائق و براہین تک پہنچنے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔

شبلی نعمانی کا شمار سوانح نگار، سیرت نویس، مورخ کے ساتھ تنقید نگار کی حیثیت سے بھی دنیائے ادب میں ہوتا ہے۔ان کے بہت سے کاموں میں تحقیقی اصول وضوابط کے اثرات نمایاں طور پر ہیں۔اس حوالہ سے ان کی کتاب ''شعر العجم''، ''موازنہ انیس و دبیر'' اور ترتیب ''تذکرہ گلشن ہند'' کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔شبلی نعمانی نے اپنی زیادہ تر تصانیف و تالیفات میں چاہے وہ سوانحی، تاریخی یا تنقیدی ہوں تحقیقی شعور کی جھلکیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔انھوں نے اپنی تصانیف میں بڑی عرق ریزی و تلاش و جستجو اور چھان بین کے بعد اپنی رائے قائم کی ہیں۔ان کتابوں میں تحقیقی نقطۂ نظر سے گرفت میں لی جانے والی خامیاں و کوتاہیاں بھی منصۂ شہود پر آئی ہیں۔مگر اس سے شبلی کی اہمیت و قابلیت اور صلاحیت میں کمی نہیں آئی۔کیوں کہ جو لوگ کام کرتے ہیں ان سے ہی غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

مولوی عبدالحق نے باضابطہ طور پر قدیم متون کی ترتیب و تدوین کا کام اپنے ذمہ لے کر باقاعدہ اس کا آغاز کیا۔ان کے بیشتر کام کی نوعیت تحقیق و ترتیب متن سے متعلق ہیں۔ان کی انہی کاوشوں کی وجہ سے اہل علم حضرات تحقیق کو اپنا شیوہ بنایا۔خواجہ بندہ نواز کی ''معراج العاشقین''، ملا وجہی کی ''سب رس'' اور ''قطب مشتری''، نصرتی کی ''گلشن ہند'' اور ''علی نامہ'' وغیرہ کو انھوں نے تحقیق و تدقیق کے بعد منصۂ شہود پر لانے میں اہم رول ادا کیا اور اردو دنیا میں اس کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا۔انھوں نے جس موضوع پر بھی کام کیا اس کو بڑی خوش اسلوبی اور چھان پھٹک کر اہل علم حضرات اور اردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔یہی نہیں بلکہ انھوں نے متن سے لے کر کاتب متن اور مرتب متن تک کے حوالے سے بھی اپنی معلومات کا انبار لگا دیا۔''باغ و بہار'' اور ''تذہ کر گلشن ہند'' کے لیے جو انھوں نے مقدمے لکھے ہیں وہ عالمانہ اور تحقیقی نقطہ نظر سے اپنی مثال آپ ہیں۔

محمود شیرانی نے لسانیات تحقیق، تدوین اور تنقید میں طبع آزمائی کی ہیں۔جیسے ''خالق باری''، ''مجموعہ نغز''، ''ہجو سلطان محمود غزنوی''، ''فردوسی پر چار مقالے'' اور ''قصہ چہار درویش'' وغیرہ ان کا نمایاں اور اہم تدوینی اور تحقیقی نوعیت کا کام ہے اور یہ کام اردو تحقیق میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔محمود شیرانی نے ادبی تحقیق کے میدان میں بت شکنی کی ابتدا کی اور انھوں نے پرانے اوہام و خیالات کے پردے چاک کر دیے اور اہل قلم کو اپنی ان کاوشوں سے باور کرایا کہ تحقیق جیسے جاں فرسا عمل میں مزید احتیاط کا دامن کیسے تھامتے ہیں۔شیرانی کی پیش نظر محقق کو خوش فہم و خوش اعتقاد نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کے تحقیق کا طریقہ کار یہ تھا کہ اب تک لوگ جو بات مانتے رہے ہیں اسے با تحقیق و تفتیش کیوں تسلیم کیا جائے۔شیرانی اپنی تحقیقی کاوش کے بعد جو نتائج برآمد کرتے تھے اسے بے کم و کاست پیش کر دیتے تھے۔جیسے خالق باری کو امیر خسرو کی تصانیف سے خارج کر کے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف بتایا ہے۔سلطان محمود غزنوی کے ہجو سے متعلق زیادہ تر اشعار کو مصنوعی اور جعلی قرار دیا ہے اور مثنوی یوسف زلیخا کو جو فردوسی سے منسوب کر دیا گیا ہے اس کا انکار اور اسے غلط قرار دینا شیرانی کا اہم اور تحقیق کی رو سے مثبت کارنامہ ہے۔

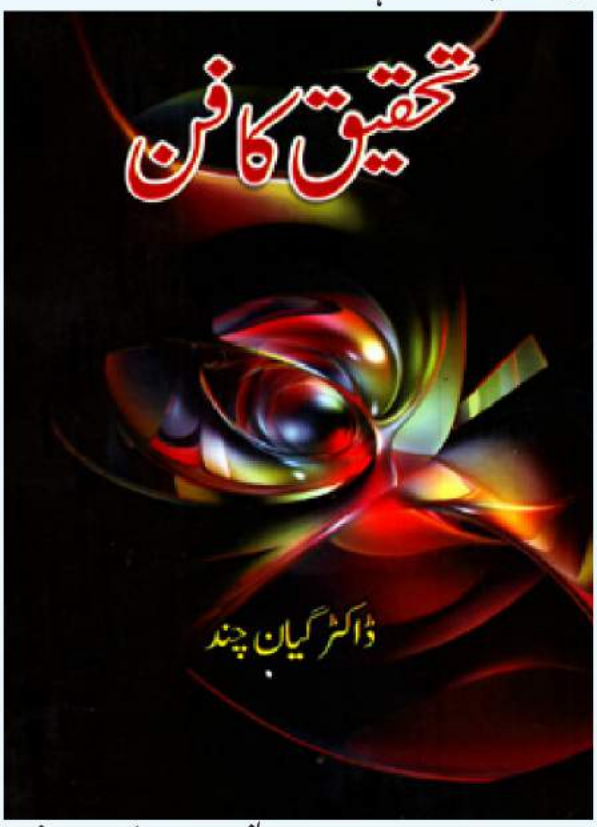

سید سلیمان ندوی نے ''سیرت النبی''، ''عربوں کی جہاز رانی''، ''خیام'' اور ''نقوش سلیمانی'' وغیرہ میں مواد کی تلاش و جستجو تحقیق و تدوین اور پیش کش و ترتیب و تہذیب کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جو ہر اعتبار سے لائق ستائش و لائق داد ہے۔''سیرت النبی''، ''عربوں کی جہاز رانی'' اور ''خیام''

ان کی تحقیقی کتابیں ہیں جن میں انھوں نے تحقیق کے اصول وضوابط کو بروئے کار لاتے ہوئے اعلیٰ تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔

مولوی عبدالحق، محی الدین قادری زور اور نصیر الدین ہاشمی نے دکنی اردو ادب میں اپنی بیش بہا خدمات انجام دے کر اردو ادب کے باب میں اہم اضافہ کیا ہے۔ زور تقریباً 4 دہائیوں تک اردو زبان وادب کی خدمت میں پوری لگن اور محنت سے لگے رہے۔ ان کا بیشتر کام دکنی ادب اور دکنیات سے متعلق ہے۔ زور نے قدیم دکنی ادب کے گمشدہ اشعار کی بازیافت اور تحقیقی اصول کا خیال کرتے ہوئے دیگر اہم وقیمتی مخطوطات کو مرتب کیا۔ مرقع سخن اور تذکرہ اردو کے علاوہ انھوں نے ''گلزار ابراہیم''، ''کیف سخن''، ''متاع سخن''، ''فیض سخن''، ''کلیات قطب شاہ'' وغیرہ کو زیور ترتیب سے آراستہ وپیراستہ کیا اور زیادہ تر مرتبہ کتابوں کی ابتدا میں دکنی ادب سے متعلق عالمانہ وفاضلانہ گفتگو بھی کی ہے۔

دکنی ادب کو پیش نظر رکھنے والوں میں ایک اہم اور مستند ومعتبر نام نصیر الدین ہاشمی کا بھی ہے۔ انھوں نے ''دکن میں اردو''، ''یورپ میں دکھنی مخطوطات''، ''اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست'' اور کتب خانہ آصفیہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد، آندھرا پردیش کے اردو مخطوطات کے توسط سے ریسرچ اسکالرز اور نئے محققین کی بڑی مدد ورہنمائی کی ہے۔ کتابوں کی وضاحتی فہرست ان کے ناقابل فراموش اور دیرپا کارنامہ ہے۔

نذیر احمد فارسی زبان وادب سے منسلک ہونے کے باوجود کچھ ایسے تحقیقی مقالے اور تحقیقی کاوشوں کو بروئے کار لائے ہیں جو جدید محققین کے لیے مفید وکارگر ثابت ہوئے۔ ان کی تحقیقی کاوشات اور مقالات میں منتخب کئے گئے اصول وضوابط ریسرچ اسکالرز کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب محقق کے ساتھ نقاد کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن پارے کو تحقیق کے اصول وضوابط کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے اس کی قدر وقیمت، اہمیت وافادیت اور اس کے مقام ومرتبہ کا تعین بھی کرتے ہیں تاکہ تحقیق وتنقید کا یہ توازن برقرار رہے۔ ایسا بہت کم محققین کے یہاں نظر آتا ہے۔ مراثی اور ڈرامے مسعود حسن رضوی ادیب کی تحقیق کے خاص موضوع ومحور اور دلچسپی لگن کا عکاس رہے ہیں۔ انھوں نے ''فیض میر''، ''مجالس رنگین''، ''فائز دہلوی''، ''دیوان فائز''، ''متفرقات غالب''، ''تذکرہ نادر''، ''فسانہ عبرت'' اور ''تذکرہ گلشن ہند'' وغیرہ کو ترتیب وتہذیب سے آراستہ کر کے منظر عام پر لانے کا اہم کام کیا۔ ''اسلاف میر انیس''، ''ایرانیوں کا مقدس ڈرامہ''، ''اردو اسٹیج اور ڈرامہ''، ''لکھنو کے شاہی اسٹیج''، ''لکھنو کا عوامی اسٹیج اور ہماری شاعری'' ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف کے عمدہ نمونے ہیں۔

''دیوان غالب نسخہ عرشی'' امتیاز علی خاں عرشی کا اردو والوں کے لیے یہ نایاب اور انمول تحفہ ہے۔ امتیاز علی خاں عرشی نے غالبیات سے متعلق ''فرہنگ غالب'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں غالب کے حوالہ سے مفید معلومات کا خزانہ ہے اور تحقیق کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ ''دستور الفصاحت''، ''نادرات شاہی''، ''سلک گوہر''، ''تاریخ محمدی''، ''تاریخ اکبری'' اور امام سفیان ثوری کی ''تفسیر القرآن الکریم'' وغیرہ کو جدید اصول وقواعد کے مطابق مرتب کیا ہے۔

قاضی عبدالودود نے اردو کے تحقیقی معیار کو بام عروج پر لانے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہ چھوڑی اور جدید وسائنٹفک طریقے سے اردو تحقیق کو روشناس کرایا اور دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ لا کھڑا کیا۔ انھوں نے اپنی نگارشات وتخلیقات سے تحقیق وتنقید کے معیار کو بلند وبالا کیا۔ ان کی تحقیقی کاوشات اردو اور فارسی زبان وادب سے منسلک ومربوط ہیں۔ انھوں نے تحقیقی وتدوینی کاموں میں احتیاط کا دامن تھامے رکھا۔ ترتیب متن کے وقت قاضی عبدالودود ا اپنے اصول اور طریقہ کار کو پوری دلجمعی کے ساتھ برتتے ہیں اور اس پر گامزن رہتے ہیں۔ انھوں نے ''دیوان جوش''، ''دیوان رضا''، ''قطعات دلدار''، ''تذکرہ ابن امین اللہ''، ''آثر غالب اور قاطع برہان'' وغیرہ کو تدوین کے اصول وضوابط اور اس کے مطالبات کا پورا خیال کرتے ہوئے مرتب کیا۔ ''عیار ستان'' اور ''اشتر وسوزن'' تحقیقی تبصرے پر مشتمل ہیں۔ ان کا کل تصنیفی وتالیفی سرمایہ اور ذخیرۂ ادب مضامین، مقالے، مقدمے اور تبصرے کی شکل میں موجود ہیں۔ قاضی عبدالودود نے دوسروں کی کتابوں پر بالاستیعاب تبصرہ وتنقید کی ہے اور ان کتابوں میں پائی جانے والی خامیوں ونقائص اور بے احتیاطیوں ولاپرواہی کو اپنی گرفت کا شکار بنایا ہے۔ اسی سبب انھیں بت شکن محقق کہا گیا اور کچھ لوگوں نے تو ان کی تحقیق کو تخریبی تحقیق کا نام دینے میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں کیا۔

اردو تحقیق کی دنیا میں مالک رام کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کو تحقیق سے ذاتی لگاؤ اور دلچسپی تھی۔ مالک رام نے اسلامیات، تذکرہ نگاری، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تحقیق کے علاوہ غالب پر اپنی کاوشات اور نگارشات پیش کی ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں ''کلیات غالب'' (فارسی)، ''دیوان غالب (اردو)''، ''خطوط غالب''، ''غبار خاطر''، ''خطبات آزاد''، ''نذر عرشی'' وغیرہ بہت ہی اہم اور معتبر ہیں۔ انھوں نے

اپنی اکثر و بیشتر مرتبہ کتابوں میں صحت متن کا خیال کرتے ہوئے محققانہ و مدبرانہ حواشی لکھے ہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے متحمل ہیں۔

خواجہ احمد فاروقی نے عمدہ منتخبہ ''کربل کتھا''، ''گنج خوبی''، ''دیوان بقا'' اور ''غالب کے غیر مطبوعہ فارسی خطوط حضرت غمگین کے نام'' اور ''خدنگ غدر'' کو جدید اصول وقواعد کے مطابق مرتب کر کے شائع کیا۔ خواجہ احمد فاروقی ترتیب متن کے وقت ایک ایک لفظ کی تلاش و جستجو تحقیق و تدقیق اور چھان بین کرتے اور اصل متن کو مصنف کی منشا کے مطابق منظر عام پر لاتے۔ ان کی مرتب کردہ کتابیں عالمانہ و ناقدانہ اور محققانہ مدبرانہ مقدمے کے ساتھ منصۂ شہود پر آئی ہیں۔

نذیر احمد کا محبوب و پسندیدہ موضوع کا محور ومنبع غالب رہا ہے۔ انھوں نے غالب کی فارسی اور اردو نثر و شاعری پر کئی تحقیقی و تنقیدی مقالے قلم بند کیے ہیں۔ ان کے مقالوں میں ترتیب واصول متن سے متعلق مفید و کارآمد معلومات کا خزانہ ہے اور تخریج صحیح متن کے اصول وضوابط بھی ہیں۔

رشید حسن خاں نے قدیم متون کی ترتیب وتہذیب اور تدوین کے اصول کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو تحقیق کے باب میں اہم اور قیمتی اضافہ کیا ہے۔ بہت سے قدیم اور نادر و نایاب کتابوں کو جدید اصول کے پیرائے کے مطابق از سر نو مرتب کیا۔ رشید حسن خاں حالات وواقعات اور حقائق و براہین کی چھان بین صحت متن اور ماخذ کی تلاش و جستجو میں قاضی عبدالودود کی طرح بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔

تنویر احمد علی کی تحقیق و تدوین کے اکثر موضوعات وعنوانات شعر وسخن کے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں ''اصول تحقیق وترتیب متن'' کے علاوہ ''کلیات ذوق''، ''انتخاب دواوین'' اور ''رسالہ تذکرات'' کی ترتیب وتدوین بہت ہی اہم ہیں۔ ''اصول تحقیق وترتیب متن'' علوی کی ایک ایسی کتاب ہے جو تمام ریسرچ اسکالرز اور جدید محققین کے لیے بہت ہی ممد ومعاون اور مددگار ہے۔ اردو تحقیق کی روایت اور ارتقا میں درج بالا محققین کا کردار یقیناً مسلم الثبوت ہے لیکن جہاں تک اردو تحقیق کی علمی روایات کا تعلق ہے تو وہ اس وقت قائم ہوئیں جب دانش گاہوں کی اعلیٰ جماعتوں میں اردو کو متعارف کرایا گیا۔ دانش گاہوں میں نہ صرف اردو بلکہ دیگر زبانوں ومضامین میں بھی ریسرچ پر زور دیا جارہا ہے۔ ان مضامین میں ریسرچ کے اصول وضوابط مغرب سے مستعار لیے گئے جن کے ساتھ اردو نے بھی مغربی طریق تحقیق سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ گذشتہ ساٹھ ستر سالوں سے ہماری دانشگاہوں میں اردو تحقیق کے اہم مرکز کے طور پر مصروف عمل ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کا یہ سفر آزادی کے آس پاس شروع ہوا اور بہت تیزی سے پروان چڑھا، گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''آزادی کے بعد ہند و پاک میں اردو کی اعلیٰ تعلیم جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ہے اس دور میں ادبی تحقیق کو اتنا فروغ ملا کہ اسے اردو تحقیق کا زرین دور کہہ سکتے ہیں۔''

اردو تحقیق آزادی کے بعد از پروفیسر گیان چند جین، مشمولہ ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریقہ کار: مرتبہ عبدالستار دلوی، ص۔230)

جامعات اور دانش گاہوں میں متعارف ہونے کے بعد اردو تحقیق نے انتہائی تیزی سے اپنے دامن کو پھیلانا شروع کیا۔ ہند و پاک کی تقریباً ہر قابل ذکر یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہے۔ جن میں ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔ جامعات سے باہر بے شمار تحقیقی ادارے اپنے اپنے دائرہ کار کے تحت تحقیق میں سرگرم عمل ہیں۔ تحقیقی رسائل اور مجلّات شائع ہو رہے ہیں۔ اس عہد میں جامعات کے اندر اور باہر مختلف شعبوں میں بہتر کام بکثرت ہوئے ہیں۔ ان میں تذکرے، ترتیب وتدوین متن، تواریخ ادب، ادبی تحقیق، شخصیات، اصناف ادب، لسانیات، فہرست کتب اور تحقیقی رسائل وغیرہ تمام پہلوؤں پر نہ صرف سندی مقالوں کی صورت میں کام ہوا ہے بلکہ مختصر مضامین، با قاعدہ تصانیف اور مجموعہ مقالات کی صورت میں بھی اردو زبان وادب کے بے شمار مخفی گوشے روشن کیے گئے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد سے اب تک اردو تحقیق کی روایت کو ثروت مند وصحت مند بنانے میں جن محققین نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں سید عبداللہ، غلام مصطفیٰ خان، وحید قریشی، سہیل بخاری، جمیل جالبی، رشید حسن خاں، مشفق خواجہ، گیان چند جین، تنویر احمد علوی، یونس حسین خاں، مسعود حسین خان، خلیق انجم، تبسم کاشمیری، ابواللیث صدیقی، شوکت سبزواری، گوپی چند نارنگ وغیرہ چند ایسے نام ہیں جو اردو تحقیق کی عمارت میں اہم ستون کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے تحقیقی کارناموں کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔

□□□

Safina khatoon
Research scholar
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

روبینہ پروین

خواتین ناول نگار
ایک جائزہ

اردو ناول نے اپنے ابتدائی سفر میں اصلاحی ناولوں کے ذریعے سماج کے فرسودہ نظام اور بوسیدہ رسم و رواج کے خلاف آواز بلند کی اور انسانی ترقی وسماجی نابرابری میں حائل نکات کو بھی پیش کیا ہے۔اس کے بعد اردو ناول نے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کے ذریعے سماجی مسائل اور انسانی تہذیب وثقافت کو پیش کرتے ہوئے انسانی نفسیات کی گرہوں کو بھی سلجھایا ہے۔مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کی کامیاب عکاسی کرکے اور پریم چند نے اپنے ناول 'گئودان' میں حقیقت پسندی کو پیش کرکے اردو ناول نگاری کو ایک نئی سمت عطا کی۔اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے آغاز سے اردو ناول میں موضوعات وافکار کے علاوہ اسلوب واظہار کی سطح پر بھی نئے امکانات کی تلاش کا عمل شروع ہوااور دیکھتے ہی دیکھتے اردو ناول نگاری نے بلندی کی نئی منزلیں طے کرنا شروع کردیں۔

اس تحریک سے قبل خواتین ناول نگار باضابطہ طور پر منظر عام پر نہیں آئیں۔خواتین کے لیے اس دنیا میں قدم رکھنا مذہبی اور معاشرتی طور پر معیوب بات مانی جاتی تھی۔اس عہد میں خواتین اپنی تخلیقات میں نام کا پردہ کرتی یا فرضی ناموں سے لکھتی تھیں۔ابتدائی خواتین ناول نگاروں میں اکبری بیگم،نذر سجاد اور حجاب امتیاز علی تاج وغیرہ کے نام اہم ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ تعلیم کی اہمیت،تعلیم نسواں کی حمایت اور معاشرے کے فرسودہ رسم ورواج کے خلاف آواز بلند کیں۔پھر جب اس تحریک کا آغاز ہوا تو خواتین ناول نگاروں نے اس میدان میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ اپنے ناموں کے ساتھ لکھنا شروع کردیا اور اپنی فکری وفنی انفرادیت سے اردو ناول نگاری میں انقلابی تبدیلیاں لانے میں کامیابی حاصل کی۔انھوں نے بالخصوص خواتین کے مسائل اور ان کی زندگی سے وابستہ پہلوؤں کو ناول میں نمایاں کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح کی خواتین ناول نگاروں میں عصمت چغتائی،قرۃ العین حیدر،خدیجہ مستور،جیلانی بانو،رضیہ سجاد ظہیر،صالحہ عابد حسین،بانو قدسیہ،رضیہ فصیح احمد اور جمیلہ ہاشمی وغیرہ ہیں۔لیکن اس مقالے میں میری گفتگو ہندوستانی خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے ہوگی۔جن میں عصمت چغتائی (ٹیڑھی لکیر) قرۃ العین حیدر (آگ کا دریا)،رضیہ سجاد ظہیر (اللہ میگھ دے)،جیلانی بانو (ایوان غزل) اور صالحہ عابد حسین (راہِ عمل) وغیرہ ہیں۔اس مقالے میں مذکورہ خواتین ناول نگاروں کے اہم ناولوں کے حوالے سے مختصر گفتگو کی گئی ہے۔

ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اردو ناول نگاری میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔عصمت چغتائی نے حقیقت پسندی اور نفسیات کی آمیزش سے شمن کا ایک ایسا کردار تخلیق کیا جو لازوال بن گیا۔ناول کے مرکزی کردار 'شمن' کی ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھلی،جہاں وہ بچپن سے ہی ماں کی محبت سے محروم

رہی۔محبت کی تلاش میں وہ ہر اس شخص میں جھانکتی رہی جہاں اسے محبت کے امکان نظر آتے تھے اور محبت کی اس تلاش میں وہ ہر تجربے سے دھوکہ کھاتی رہی ۔ یہ تمام عناصر اس کی نفسیات میں کجی پیدا کر اسے ضدی اور بغاوتی بنا دیتے ہیں۔ مسلم متوسط طبقے کی لڑکیوں کی نفسیات اور ذہنی الجھنیں عصمت چغتائی کی کہانیوں کے اہم موضوعات ہوتے ہیں۔اس ناول میں انھوں نے کرداروں کی نفسیات کے ذریعہ متوسط طبقے کی نئی اور پرانی قدروں کے درمیان کے تصادم اور کشمکش کو پیش کیا ہے۔انھوں نے شخصی تعمیر میں ماحول اور فضا کی اہمیت کو واضح کیا ہے ۔ایسی فضا جہاں متوسط طبقے کی لڑکیاں گھریلو ماحول سے نکل کر اسکولوں اور کالجوں کی طرف جا رہی ہیں اور ان میں ذہنی بالیدگی و روشن خیالی آ رہی ہے تو دوسری طرف یہ طبقہ اپنی تہذیبی، معاشرتی، مذہبی اور پرانی قدروں سے پیچھا چھڑانے میں ناکام ہے۔نتیجتاً وہ اس طرح کے ماحول میں نفسیاتی الجھن اور مریضانہ ذہنیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ناول ''آگ کا دریا''میں تقریباً ڈھائی ہزار سالہ ہندوستانی تہذیب کی تاریخ کو مجتمع کیا ہے۔جس میں مشترکہ تہذیب کی تاریخ،قدیم ہندوستان کی عظمت اور اس تہذیب وثقافت کے عروج اور پستی کی داستان کو تاریخی آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں فکر وتکنیک کی نئی جہت' آگ کا دریا' کو شاہکار بناتی ہے۔ یوں تو قرۃ العین حیدر نے شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال اپنے سبھی ناولوں میں کیا ہے۔لیکن ناول ''آگ کا دریا''میں یہ تکنیک اپنے عروج پر ہے۔اس ناول کے مرکزی کردار ہندوستانی تاریخ کے مختلف ادوار کو مختلف روپ میں پیش کر اپنے عہد کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ناول کے بنیادی کردار گوتم، کمال، چمپا اپنے ناموں کی معمولی تبدیلی سے ہندوستان کی تاریخی وتہذیبی ادوار کی کڑی کو منسلک کرتے ہیں۔اس ناول میں دونوں ہی کردار مرد اور عورت میں مساوات کا پیمانہ تقریباً ہر درجے پر برابر نظر آتا ہے۔چمپا، طلعت اور نرملا ذہین اور باشعور ہیں۔وہ علم کی ہر سطح پر گوتم، کمال اور شنکر سے بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کرتی ہیں۔اس ناول میں ایسے باشعور اور صاحب فکر کرداروں کو منتخب کیا گیا ہے جو اپنے زمانے اور عہد کے سیاسی ،سماجی اور تہذیبی صورت حال پر غور وفکر کرتے ہیں۔ان کی روشنی میں کردار کے شعور کے رو میں چلنے والے خیالات کے ساتھ ان کے عہد کا مطالعہ تاریخی آئینے میں سامنے آتا ہے۔

ناول ''ایوان غزل'' حیدرآباد کے ماحول ومعاشرے کو پیش کرتا ہے ۔اس ناول میں جاگیردارانہ نظام کی شان وشوکت کے برعکس ان تاریک پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جو اس نظام کو ظاہری حسین لبادوں میں چھپائے ہوئے تھے۔اس ناول میں ملک میں ابھرتی ہوئی انقلابی صورت حال کی عکاسی بھی ملتی ہے۔جیلانی بانو نے اس ناول میں جاگیردارانہ ماحول اور معاشرت میں عورتوں کی حیثیت اور ان کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار غزل کو اس کے والد ذریعہ معاش کے لیے ڈرامہ اور اسٹیج کی دنیا میں بھیج دیتے ہیں اور اس کی زندگی غلط راہ پر آ جاتی ہے۔ناول کا دوسرا اہم کردار چاند کی زندگی بھی غزل سے مختلف نہیں یہ کردار بھی راشد کے مقصد کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔دوسری طرف قیصر اور کرانتی کا کردار اس استحصالی نظام کے خلاف ابھرتی ہوئی نئی قوت کا ترجمان ہے۔جیلانی بانو نے ماحول اور کرداروں کی خصوصیات کو پیش کرنے کے لیے جزئیات نگاری کو بہ خوبی پیش کیا ہے ۔جس سے اس عہد کی سماجی اور تہذیبی فضا پر روشنی پڑتی ہے۔زبان سادہ اور عام فہم ہے۔لہذا حیدرآباد کی مخصوص زبان کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔

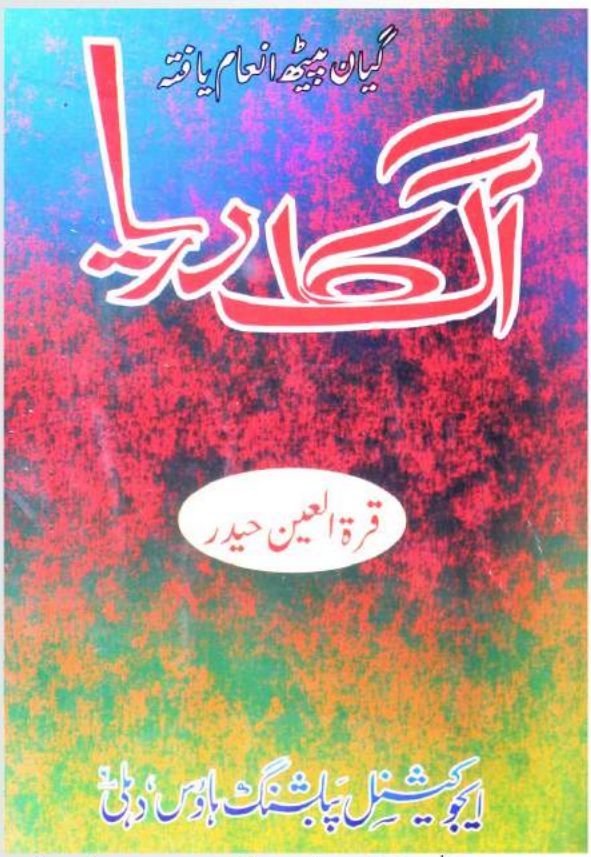

رضیہ سجاد ظہیر کے تین ناول اللہ میگھ دے، سرِ شام اور سمن مشہور ہوئے۔رضیہ سجاد ظہیر آغاز سے ہی ترقی پسند تحریک کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ ذہنی طور پر اس رجحان سے مناسبت رکھتی تھیں۔ان کے ناولوں میں ترقی

پسند رجحانات کی نشاندہی ملتی ہے اور ناولوں کے کردار انقلابی ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ کردار اپنی زندگی اور ملک میں ایک خوش آئند انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں۔ناول ''اللہ میگھ دے'' میں سیلاب کی تباہی کا منظر پیش کیا گیا ہے اور اس تباہی کا ذمہ دار نااہل افسران کو ٹھہرایا گیا ہے۔ترقی پسند ذہن رکھنے والے یہ کردار ایک ایسے سماج کا خواب دیکھتے ہیں جہاں ادنی طبقہ اور محنت کش عوام کی زندگی میں ایک نیا موڑ آئے اور صدیوں سے رواں ظلم اور استحصال کو ختم کیا جا سکے۔ناول کے کردار نیتا، دیبا، نریندر اور نہال اسی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

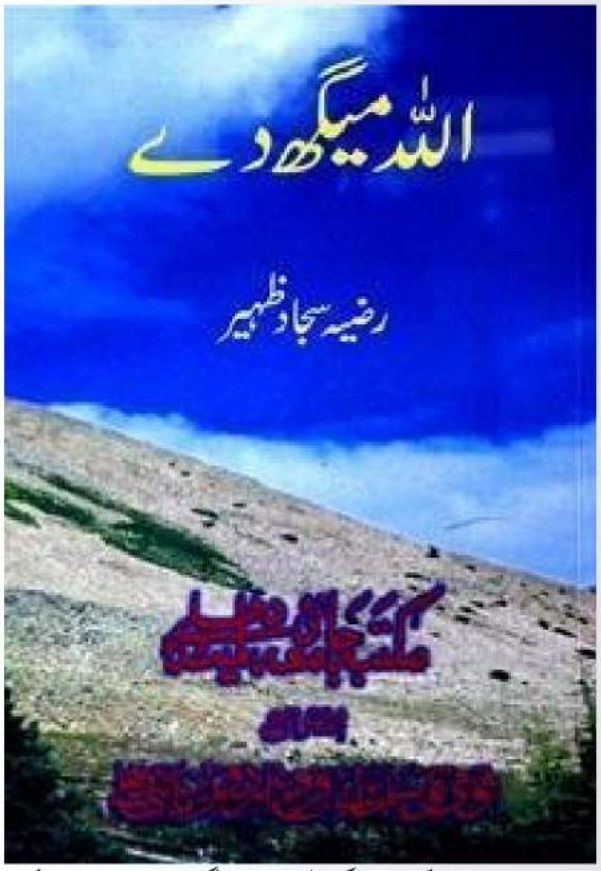

ناول ''اللہ میگھ دے'' لکھنؤ کی سماجی زندگی، متوسط طبقہ کے مسائل اور مزدوروں کے حالات کو بھی پیش کرتا ہے۔جس میں اعلی سوسائٹی کے حالات اور متوسط طبقہ کے روزگار اور تعلیم وسیاست کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔دیبا ایک ٹیچر ہے اور اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حالات کا مقابلہ کرتی ہے۔نیتا ایک مصور ہے وہ مسائل سے دور دوستوں کے ساتھ کالج لائف اور سیر وتفریح میں وقت گزارتی ہے۔نہال غریب ماں کا بیٹا اور انجینئر ہے جسے ملک اور عوام کی خدمت کی فکر ہے اور نریندر دواؤں پر ریسرچ کرتا ہے۔

صالحہ عابد حسین کے متعدد ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کے سبھی ناول سماجی اور اخلاقی ہوتے ہیں، انھوں نے اپنے ناولوں میں اپنے عہد کے مختلف معاشرتی اور اخلاقی دھاروں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ناول ''راہِ عمل'' میں آزاد ہندوستان کی ترقی اور عوام کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے عملی کاوشوں کو واضح کیا گیا ہے۔اس ناول میں گاؤں کے پس منظر میں ملک کے بنیادی مسائل کو پیش کر عوام کے فلاح و بہبود اور ترقی میں حائل مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔بالخصوص عورتوں کے حالات کو بہتر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان میں تعلیم، حقوق اور مساوات کی بیداری پر خصوصاً توجہ دی گئی ہے جس سے پسماندہ طبقہ علم کی روشنی میں اپنی حیثیت ومقام کا تعین کرتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار گیتا ہے۔اس کردار میں نئے زمانے کی عورت نظر آتی ہے جس میں خود اعتمادی، ذہانت، ترقی پسند خیالات کے ساتھ اخلاقی قدروں کی پاسداری اور اپنے حقوق کے تحفظ اور فیصلہ کرنے کی قوت بھی ہے۔

گیتا کے دل میں قومی خدمت کا جذبہ بڑی حد تک موجود ہے۔ اس کام کو وہ محلے سے شروع کرتی ہے۔وہ خواتین میں تعلیم کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور گاؤں والوں میں ذہنی بیداری و خیالات میں تبدیلی لانے کوشش کرتی ہے۔ یہ کردار ناول میں تقریباً نصف حصے تک ایک آدرش کردار کے طور پر نظر آتا ہے۔لیکن ناول کے آخر میں نئی نسل کی کشمکش کے جس دور کو پیش کیا گیا ہے وہ نئی اور پرانی تہذیب، نئے و پرانے سماج اور گاؤں سے شہری تبدیلیوں کا دور ہے جس سے وہ دوچار ہوتے ہیں۔ایسے میں گیتا کا کردار کافی حد تک فطری معلوم ہوتا ہے۔

متذکرہ خواتین ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔جس میں اس عہد کی حقیقت اور عصری واقعیت نمایاں ہوتی ہے۔ان ناولوں میں بیشتر ناول قبل جنگ آزادی اور جنگ آزادی کے بعد تک کے عہد کا احاطہ کرتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں سے ان کے موضوعات اور مسائل کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور ناول نگاروں کے ناولوں میں فنی وفکری اور نفسیاتی اعتبار سے ارتقا کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ایک طرف ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری کا رجحان بڑھا تو دوسری طرف علم نفسیات کی وجہ سے ان کی توجہ انسانی نفسیات کی طرف مبذول ہوئی۔جس کے ذریعہ ناول نگاروں نے انسان کے اندرون میں اتر کر دیکھا۔یہ خصوصیات عصمت چغتائی کے ناولوں کا حصہ ہے۔جس سے شمن کا ایک لازوال کردار اردو ناول کو ملا۔انھوں نے متوسط مسلم گھرانے کی لڑکیوں کی

نفسیاتی الجھنوں کو پیش کر یہ عیاں کرنے کی سعی کی ہے کہ گرد و پیش کے ماحول اور سماجی و معاشی اقدار کسی بھی انسان پر کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کا انسان کی نفسیات، ذہنیت اور شخصیت کی تعمیر میں اہم رول ہوتا ہے۔ اردو ناول کو فلسفے اور نئے اسالیب سے متعارف کرانے میں قرۃ العین حیدر کا ایک اہم مقام ہے۔ انھوں نے ناول کے فنی معیار کو استحکام بخشا اور اردو ناول کو انٹلکچول کردار عطا کیا۔ ناول میں چمپا، طلعت اور نرملا کی ذہانت، دانشوری، وسیع النظری اور علم کی ہر سطح پر وہ گوتم، کمال اور شنکر سے بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کرتی ہیں۔ چمپاوتی کا کردار معمولی فرق سے ہر ادوار کے عصری عہد میں عورتوں کی سیاسی، سماجی حصہ داری اور ان کے مقام و حیثیت کو پیش کرتا ہے۔ متذکرہ ناولوں میں یہ بات مشترکہ طور پر نظر آتی ہے کہ ان ناولوں کے مرکزی کردار بیشتر نسوانی ہیں۔ یہ کردار روایتی کرداروں سے مختلف ہیں۔ یہ ملک و سماج کی بہتری کے لیے عمل کا جذبہ بھی رکھتی ہیں اور ذہنی، علمی، نفسیاتی حتیٰ کہ ہر سطح پر مضبوط، باوقار، خود اعتماد اور عزم سے آراستہ ہیں۔ ان ناولوں میں عورتوں کے مختلف طبقوں کے سماجی مسائل کی عکاسی ملتی ہے جسے ناول نگاروں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا ہے۔ ان ناولوں میں جہاں طبقہ اشرافیہ، جاگیر دارانہ ماحول اور معاشرت میں عورتوں کی زندگی سامنے آتی ہے تو اسی ماحول میں زندگی گزارنے والے ادنی طبقے کی عورتوں کے سماجی اور معاشی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ خواتین کی ناول نگاری کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”۔۔۔۔ رشید جہاں اور عصمت چغتائی نے نہ صرف نذر سجاد حیدر اور حجاب کے فن کی رومانوی آراستگی سے گریز کیا بلکہ پریم چند کی حقیقت نگاری کے تصور کو بھی نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ وہ جذباتی ڈھنگ سے مثالی کردار نہیں تراشتیں۔ ان کے کردار زیادہ ٹھوس اور پہلو دار ہیں۔ سماج کے زیادہ پیچیدہ مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی نے نفسیاتی تجزیہ سے بھی کام لیا ہے اور جنسی رشتوں پر بھی بے باکی سے لکھا ہے۔ یہی وہ توانا روایت تھی جس سے ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، صدیقہ بیگم سیوہاروی، رضیہ ظہیر سجاد، شکیلہ اختر اور کچھ آگے چل کر جیلانی بانو، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن اور دوسری خواتین نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔“

(پروفیسر قمر رئیس، اردو میں خواتین کا ادب، شعبہ اردو ڈی۔ایس۔اے پروگرام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص 4)

ترقی پسند ذہن کی مناسبت سے رضیہ سجاد ظہیر کے یہاں انقلابی اور ترقی پسند رجحانات کی نشاندہی ملتی ہے۔ جہاں ایک طرف نیتا ایک مصور ہے اور وہ مورتیاں بناتی ہے۔ وہ لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے کی لڑکیوں کی طرز زندگی اور فکر و خیال کو پیش کرتی ہے۔ اس میں ہمدردی کا جذبہ ہے وہ کیمپ میں سیلاب زدہ بچوں کے غم سے راحت کے لیے موسیقی کرتی ہے۔ دوسری طرف دیبا کے عملی کاوشوں سے سماج کے ایک وسیع طبقے یعنی ٹیچرز کو اپنے مطالبے میں کامیابی ملتی ہے۔ اس میں انسانیت کے تحفظ کا جذبہ ہے۔ علاوہ ازیں مختلف سیاسی و سماجی تہذیبی و ثقافتی تبدیلوں کے جو اثرات خواتین ناول نگار پر مرتب ہوئے ان کے شعور کی پختگی اور فنی صلاحیت کو قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور جیلانی کے ناولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تمام ناول اپنے عہد اور سماج کے عکاس ہیں جو منفرد اسالیب، موضوعات، زبان و بیان کی ادائیگی اور تکنیک کے حوالے سے اردو ناول میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

□□□

Rubeena Parween
Koyna Hostel
JNU
New Delhi-110067

شاعرات کے منتخب اشعار

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر
لب پیوستہ لب شہد فشاں سے بہتر

صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر
دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر

ز۔خ۔ش

ہم تو اپنی ہی ذات میں گم تھے
دل نوازی کا کیا زمانہ تھا

کھو گیا جانے کس جگہ شمع
ہائے بچپن بھی کیا زمانہ تھا

خورشید بانو شمع

میرے پندار شکستہ پہ نہ جا میرے حبیب
کون ہے دہر میں جو کشتۂ تقدیر نہیں

میرے باطن میں جو انسان ہے پہچان اسے
میرے چہرے پہ مرے ذہن کی تصویر نہیں

عرفانہ عزیز

ہونٹوں پہ کبھی ان کے میرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسر الزام ہی آئے

لمحات مسرت ہیں تصور سے گریزاں
یاد آئے ہیں جب بھی غم و آلام ہی آئے

ادا جعفری

کسی کا حسن تصور کسی کا ذوق نظر
خیال و خواب سہی عالم شباب میں ہوں

مجھے حقیر تو کہہ لو مگر ہوں خوش نصیب
میں اک خار سہی سایۂ گلاب میں ہوں

خورشید بانو شمع

ایک کے گھر کی خدمت کی اور ایک کی دل سے محبت کی
دونوں فرض نبھا کر اس نے ساری عمر عبادت کی

جامۂ الفت بنتے آئے رشتوں کے دھاگوں سے ہم
عمر کی قینچی کاٹ گئی سب، کاہے کو اتنی محبت کی

زہرہ نگاہ

وہ چاند چھپ گیا تھا اچانک پس شجر
اے حسن سوگوار ترے ساتھ کون تھا

وہ آ کے تیرے شہر سے جا بھی چکا مگر
چشم امیدوار ترے ساتھ کون تھا

فہمیدہ ریاض

یوں خیالوں میں ترے لہجے کی نرمی آئی
تو نہ بولے تو تری آنکھ کا جادو بولے

ہے خموشی میں بھی انداز تکلم اس کا
کبھی آنکھیں، کبھی چہرہ، کبھی بازو بولے

صدیقہ شبنم

(ماخذ: اردو شاعرات اور نسائی شعور، ڈاکٹر فاطمہ حسن، 2022، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی)

پروفیسر نسرین بیگم علیگ

آخر کیوں؟

عائشہ کو پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔وہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی ۔جب وہ دو سال کی تھی تو اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔والد نے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا۔اسے ہر طرح کی آسائش مہیا تھی ۔والد کی ہر ممکن کوشش رہتی کہ اسے ماں کی کمی کا احساس نہ ہو۔مگر یہ حقیقت ہے کہ ماں کی جگہ تو کوئی لے ہی نہیں سکتا۔۔۔عائشہ اپنی ماں کو یاد کرتی رہتی۔۔۔ دل ہی دل میں سوچتی ۔۔۔اماں ! کہیں دور چلی گئیں ،کب آئیں گی۔ اسے یہ انتظار رہتا۔معصوم بچی تھی۔۔۔۔۔اسے یہی بتایا گیا کہ اماں جلد آجائیں گی۔۔۔۔

جب تھوڑی بڑی ہوئی تو سمجھنے لگی کہ۔۔۔۔اماں اب کبھی نہیں آئیں گی اور اب ہمیں تنہا ابو کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہوگی۔

والد نے عائشہ کی پڑھائی میں کوئی کمی نہ کی۔عائشہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی تو میں سکون سے مر سکوں گا۔

میرے بعد بیٹی کو کون دیکھے گا۔۔۔۔اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے گی تو رشتہ بھی اچھا ملے گا۔۔۔۔پڑھے لکھے لوگ ہوں گے تو اس کی قدر ہوگی۔ ساری زندگی خوش رہے گی۔۔۔ہمیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔

ایک باپ کے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو سکتی ہے۔عائشہ دل لگا کر پڑھتی رہی۔اور اول نمبر سے کامیاب ہوتی رہی۔۔۔۔

عائشہ کی خواہش تھی کہ وہ کہیں باہر جا کر تعلیم حاصل کرے۔اور ایک وکیل بنے۔لاء کی ڈگری تو کہیں باہر سے ہی حاصل کرے اور ایک کامیاب وکیل بن کر وہ کچھ ایسا کرے جو بہت خاص ہو۔جبکہ لڑکیوں کے لیے یہ پیشہ اتنا آسان بھی نہیں۔مگر نہ جانے کیوں بچپن سے ہی عائشہ کے دل میں یہ تمنا تھی۔جبکہ والد نے بہت سمجھایا کہ تم لڑکی ہو کوئی آسان راستہ سوچو۔تمھارے لیے یہ سب آسان نہیں ہے۔لڑکی اور وکالت کا پیشہ۔۔۔ مشکل ہے۔۔۔۔ابھی ہمارا معاشرہ اتنا نہیں بدلا ہے۔

عائشہ نے انٹرنس کا امتحان معیاری نمبروں سے پاس کر لیا۔قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تو اسے باہر ہی جانا تھا اور یہ اس کی دلی خواہش بھی تھی۔یہ سچ ہے کہ اگر لگن اور جنون ہو تو خواہش ضرور پوری ہوتی ہے۔۔۔۔اور یہ بھی سچ ہے کہ کامیابی انھیں کو ملتی ہے جو خود کو مشکل سے مشکل کام کرنے کے لائق بنا لیتے ہیں اور ہمت نہیں ہارتے۔

لاء یونیورسٹی آف لندن میں عائشہ کا داخلہ ہو گیا تھا اور اسے رہنے کے لیے ہوسٹل بھی مل گیا۔اس کی دلی خواہش پوری پوری ہو گئی۔

ہوسٹل کی پہلی رات عائشہ سہمی ہوئی تھی ۔اس کے دل میں ایسا خوف جو شاید کبھی ختم نہ ہو۔وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی ۔اسی دوران سینیئرس کا ایک گروپ جو پہلے اس دور سے گزر چکی تھیں جیسا کہ ہوسٹل کا طریقہ ہوتا

ہے کہ وہاں کے دستور نئی اسکالرس کو بتائے جاتے ہیں تا کہ وہ آنے والے اسکالرس کو جو کچھ انھوں نے سیکھا ہے اس سے روشناس کرائیں۔ وہاں کے طور طریقے سے انھیں واقف کرائیں۔

ایک سینئر نے پوچھا تمھارا نام ۔۔عائشہ، گھر۔۔۔پٹنہ ۔۔۔ دوسری سینیئر بولیں۔۔۔۔ارے بڑی دور دراز سے آئی ہو۔۔۔انڈیا سے ہو۔ایک کے بعد ایک سوالات۔۔۔۔

ہر سوال کا جواب دینا جیسے آسان نہیں۔ ہر جواب پر تنقید اور کوئی نیا پہلو۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔۔۔۔کچھ سوالوں کے جواب دینے کے بعد جیسے کچھ راحت ملی اور لگا چلو اب آگے کی منزل کچھ آسان ہوئی۔

آخر کار جان بچی۔۔۔عائشہ نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کو ایسا لگا کہ میں یہاں کیسے رہوں گی۔ یہاں کی زندگی تو بہت الگ ہے۔ چند دنوں میں ہی اس نے محسوس کر لیا کہ یہاں آرام کم اور کام زیادہ ہے۔ یہاں ہر اسکالر کے اندر کچھ کرنے اور کچھ الگ بننے کی خواہش ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں رات گزر گئی۔۔۔۔عائشہ کی دلی خواہش اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ اب تو اسے قانون کی ڈگری لے کر ہی اپنے وطن ہندوستان واپس جانا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کا دل لگنے لگا۔ صرف پڑھنا ہی اس کا کام تھا۔ اس کو وہاں کا ماحول بھی اب اچھا لگنے لگا۔

مگر والدہ کے نہ ہونے سے عائشہ کے والد کو یہ فکر لگی رہتی کہ وہ جلد اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائیں۔۔

عائشہ کی شادی اچھی جگہ ہو جائے۔۔شریف لوگ ملیں۔۔۔اس کی قدر کرنے والے ہوں۔ محبت کرنے والے ہوں۔

عائشہ ذہین اور سمجھدار تھی۔ اس کے رشتے تو بہت آ رہے تھے مگر اس کے سامنے جو مقصد تھا وہ اسے شادی کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پتہ نہیں وہ جو کرنا چاہتی ہے آگے وہ کر پائے گی یا نہیں۔ یہ اس کے سامنے بہت بڑا سوال تھا۔

اس دوران اس کی ملاقات ایک ایسے لڑکے سے ہوئی جو اسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور اتفاق سے اسی کے وطن یعنی پٹنہ کا ہی رہنے والا بھی تھا۔

عائشہ سے اس کی کئی بار ملاقات بھی رہی۔ اس کا پہلا سوال یہی تھا کہ قانون کی پڑھائی کا راستہ تم نے کیوں چنا؟

لڑکیوں کے لیے یہ مشکل راستہ ہے۔۔۔۔۔

عائشہ نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا مقصد بھی بتایا کہ اس نے یہ راستہ کیوں چنا۔

راستہ تو مشکل ہے۔۔۔مگر مشکل راستے پر چلنا کوئی غلط فیصلہ تو نہیں ہے۔

عائشہ کی باتوں کو سننے کے بعد عائشہ سے سلیم کو تھوڑی ہمدردی پیدا ہوئی اور وہ اس کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھا۔

دن گزرتے گئے اور اب عائشہ قانون کی ڈگری لے کر اپنے وطن واپس آ چکی تھی۔

سلیم نے اپنی والدہ سے عائشہ کے بارے میں بتا رکھا تھا۔۔

> **والد کو عائشہ کی شادی کی فکر تھی۔وہ خوش تھے کہ عائشہ نے اپنے معیار کے مطابق سلیم کو پسند کر لیا ہے۔انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ جس خواہش کو لے کر عائشہ آگے بڑھ رہی ہے،سلیم سے شادی ہونے کے بعد اس میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں آئے گی ۔۔۔یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہمیں تو عائشہ کی خوشی چاہیے۔**

امی لڑکی بہت اچھی ہے اور اپنے شہر پٹنہ کی بھی ہے۔۔۔آپ ملیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ ایک بار عائشہ سے ملاقات ضرور کریئے۔ والدہ سلیم کا اشارہ سمجھ رہی تھیں۔

ایک روز سلیم کی والدہ عائشہ کے گھر آئیں۔ عائشہ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ تم جیسی لڑکی ہمیں کہاں ملے گی۔ اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئیں۔

والد کو عائشہ کی شادی کی فکر تھی۔ وہ خوش تھے کہ عائشہ نے اپنے معیار کے مطابق سلیم کو پسند کر لیا ہے۔ انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ جس خواہش کو لے کر عائشہ آگے بڑھ رہی ہے، سلیم سے شادی ہونے کے بعد اس میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں آئے گی۔۔۔۔یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہمیں تو عائشہ کی خوشی چاہیے۔

ورنہ عام طور پر تو لڑکیاں تعلیم تو حاصل کر لیتی ہیں مگر وہ جو کرنا چاہتی ہیں کر نہیں پاتیں اور ان کی خواہش دل ہی رہ جاتی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اور یہ دیکھا گیا ہے کہ شادی ان کے دوسرے کاموں میں رکاوٹ

بن جاتی ہے اگر لوگ سمجھدار نہ ہوں۔ایسے میں یا تو شادی کر کے لڑکیاں گھر بسالیں یا پھر شادی ہی نہ کریں۔۔۔کیا ہم لوگوں کی اس سوچ کو بدل سکتے ہیں؟

ہمیں سوچنا ہوگا۔۔۔لڑکیاں اعلیٰ تعلیم تو حاصل کر رہی ہیں مگر شادی ان کے سامنے ایک بڑا مسئلہ ہے۔۔۔غور طلب بات تو یہ ہے کہ لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں لڑکیوں سے پیچھے ہیں۔۔۔لڑکے اگر تعلیم میں سنجیدہ ہو جائیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔۔مگر کیسے۔۔۔۔اور اگر چند اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکے ہیں بھی تو ان کے خیالات ہی کچھ اور ہیں۔۔۔۔

سماج کے سامنے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسر روزگار لڑکیوں کو لے کر ایک بڑا مسئلہ سامنے کھڑا ہے۔۔۔۔

عائشہ کے والد خوش تھے کہ چلو ایک سمجھدار لڑکا ہماری عائشہ کے لیے مل گیا۔۔۔اب عائشہ وہ سب کچھ کر سکے گی جو اس نے بچپن سے سوچا تھا۔ وہ ان مظلوم خواتین کی مدد کر سکے گی جو بے سہارا، بیوہ، تنہا اور مجبور ہیں۔

لڑکی بھی انھیں پڑھی لکھی اور خوبصورت چاہیے اور ساتھ میں جہیز اور کیش بھی۔کیا لڑکی کے والدین نے لڑکی کو پڑھانے میں روپئے خرچ نہیں کیے۔۔۔ایسے لالچی لوگوں کو تو بغیر پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لینی چاہیے۔کیونکہ اس سماج میں ایک طبقہ ایسا ہے جو جہیز تو اکٹھا کر لیتا ہے مگر لڑکی کی تعلیم پر خرچ نہیں کرنا چاہتا۔وہ یہ سوچ کر کہ پڑھانے کے بعد بھی تو جہیز دینا ہی ہوگا۔۔تو یہ رقم اس وقت ہم کہاں سے لائیں گے۔

سلیم گریجوایشن کرنے کے بعد دوسرے امتحانات بھی دیتا رہا۔ اس نے آئی اے ایس کا ریٹن کو الیفائی کر لیا۔۔۔عائشہ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئی اور عائشہ کے والد کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ان کی تو مانگی مراد جیسے پوری ہوگئی۔۔۔مگر آگے کیا ہونے والا ہے کسے معلوم۔۔۔

عائشہ اور اس کے والد کو کیا معلوم تھا کہ جو کچھ سوچا تھا وہ بس ایک خیال تھا۔۔۔تصویر کا دوسرا رخ تو کچھ اور ہی تھا۔

سلیم کی والدہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئی تھیں۔۔۔۔۔عائشہ کے والد کو سلیم کی والدہ کے آنے کا بے صبری سے انتظار تھا۔

مگر سلیم کے والدین کو اب ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو ان کے گھر کو دولت سے بھر دے۔دنیا کی تمام آسائش اپنے دامن میں سمیٹ کر لے آئے۔جیسے اب چیک کیش کرنے کا موقع آ گیا ہے۔۔۔

ہمارا سلیم اب بڑا افسر ہوگا۔تحریری امتحان تو پاس کر لیا۔۔۔نہ جانے انٹرویو میں کیا ہو۔اس لیے انھیں جلدی تھی۔۔۔سلیم کی بس جلدی سے شادی ہو جائے۔منہ کھول کر ہاتھ پھیلا کر لڑکی والوں سے مانگنے میں انھیں کوئی شرم نہیں تھی۔اس پر یہ کہتے ہیں کہ آپ جو کچھ دیں گے وہ آپ کی لڑکی کا ہوگا۔ہمیں اس سے کیا۔۔۔

ہمیں تو کیش اس لیے چاہیے کہ ہم نے سلیم کو پڑھانے میں بڑے روپے خرچ کیے ہیں۔بڑی یونیورسٹی لندن بھیج کر پڑھایا ہے۔پوری فیس ادا کی ہے اور نہ جانے کتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔اب تو آرام کے دن آئے ہیں۔۔۔انھیں یہ پرواہ نہیں تھی کہ جس سے وہ تقاضہ کر رہے ہیں ان لوگوں نے بھی تو اپنی لڑکی کو پڑھانے میں روپے خرچ کیے ہیں۔

لڑکی بھی انھیں پڑھی لکھی اور خوبصورت چاہیے اور ساتھ میں جہیز اور کیش بھی۔کیا لڑکی کے والدین نے لڑکی کو پڑھانے میں روپئے خرچ نہیں کیے۔۔۔۔ایسے لالچی لوگوں کو تو بغیر پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کر لینی چاہیے۔کیونکہ اس سماج میں ایک طبقہ ایسا ہے جو جہیز تو اکٹھا کر لیتا ہے مگر لڑکی کی تعلیم پر خرچ نہیں کرنا چاہتا۔وہ یہ سوچ کر کہ پڑھانے کے بعد بھی تو جہیز دینا ہی ہوگا۔۔۔تو یہ رقم اس وقت ہم کہاں سے لائیں گے۔

مگر لڑکے والوں کو تو لڑکی بھی پڑھی لکھی چاہیے اور جہیز اور اور کیش بھی۔۔۔۔یہ مرض تو تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔

لڑکے والوں کو ہی پورا پورا حق ہے کہ وہ اپنی تمام خواہش جہیز لے کر پوری کر لیں۔جہیز کو رسم و دستور کا جو نام دے دیا گیا ہے۔

شادی کرتے وقت لڑکے والے پہلے ہی یہ پوچھتے ہیں کہ شادی کیسی کریں گے۔۔۔۔مطلب صاف ہے۔۔جہیز کی مانگ۔۔

میں جہیز کی بیماری اتنی تیزی سے پھیل چکی ہے کہ اس کا علاج اب مشکل ہی نظر آ رہا ہے۔۔۔کیا ہوگا اس معاشرے کا۔۔۔کیا لڑکیاں اسی طرح ٹھگی جاتی رہیں گی۔۔۔کب تک۔۔۔یہ سماج کے سامنے ایک بڑا مسئلہ ہے۔

اس مرض کو بڑھانے والے وہ چند دولت مند لوگ ہی ہیں۔۔۔ ان کا دولت سے دل بھرتا ہی نہیں۔۔۔

انھیں غریبی کے درد کا احساس کہاں۔۔۔
ان کی آنکھوں پر موٹا پردہ پڑا ہوا ہے۔۔۔۔
لڑکی کی شادی اگر کسی طرح ہو بھی جائے تو جہیز کم لانے کی وجہ سے اس کا خمیازہ اسے سسرال جا کر بھگتنا ہوتا ہے۔
اور سوائے گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنے کے اس کے پاس کوئی راستہ نہیں بچتا۔۔۔کیا ہو گیا ہے ہمارے معاشرے کو۔۔۔۔
لڑکے والے اگر یہ سوچ لیں کہ ہمارے پاس بھی لڑکی ہے تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔۔۔۔
بڑی چونکانے والی بات تھی کہ جب عائشہ کو یہ سب کچھ معلوم ہوا تو پل بھر میں اس کے خواب بکھر گئے۔وہ تو بہت کچھ سوچے بیٹھی تھی۔اسے کیا معلوم تھا کہ لڑکی کی آگے کی قسمت اس کے سسرال والے لکھتے ہیں۔ اور اسی پر اسے چلنا ہوتا ہے ورنہ بے شرم، غیر ذمہ دار، تیز اور نہ جانے کون کون سے القاب اسے دے دیے جاتے ہیں۔
جہیز تو عائشہ کے گھر والے بھی دے سکتے تھے مگر عائشہ جہیز کے خلاف تھی۔
سلیم کے والدین لڑکی کی تلاش میں لگ گئے۔جلد رشتہ بھی مل گیا اور منہ مانگی دولت بھی حاصل ہو گئی۔۔۔مگر لڑکی ساتویں درجہ پاس تھی۔۔ والدین تو دولت حاصل کر کے خوش تھے۔۔۔مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ سلیم کے بلند خواب کا محل کتنا مضبوط اور پائدار رہتا ہے۔
چلیے اگر کم پڑھی لکھی لڑکیوں کے رشتے اچھی جگہ ہو جائیں تو برا کیا ہے۔۔۔
مگر جواب تو کچھ اور ہی ہے یہ ہم اور آپ سمجھ سکتے ہیں۔۔۔۔
لڑکی ہائے ری۔۔۔اس کی قسمت ۔۔۔اس چکا چوندھ دنیا میں۔۔۔اس کی قسمت کا ستارہ کہیں جھلملاتا ہی نظر آ رہا ہے۔۔
علامہ اقبال کے اس مصرع پر اگر غور کریں ع
وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
ہم عورت سے تو امیدیں ساری رکھتے ہیں۔مگر اسے کچھ دل کھول کر دینا نہیں چاہتے۔۔۔واہ رے دنیا اور اس دنیا میں رہنے والے لوگ ۔۔۔ہم عورت کی اہمیت کو پہچان نہ سکے جب کہ کائنات میں رونق اسی کی وجہ سے ہے۔
عائشہ نے اپنے والد سے پہلے ہی کہا تھا کہ ایسے لڑکے کے ساتھ وہ خود شادی نہیں کرے گی جو وقت کے ساتھ اپنا ایمان تک بیچنے کو تیار ہو۔جو دولت کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو۔لوگ دولت کے لالچ میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ انھیں کچھ نظر ہی نہیں آتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔
عائشہ نے کہہ دیا کہ ان سے پہلے میں انکار کرتی ہوں۔ہم لڑکیاں لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں۔۔۔لوگ ہمیں بدقسمت کہیں گے اور یہ بھی کہیں گے کہ دیکھو کا اس کا رشتہ نہیں ہوا ۔۔۔ کوئی تو وجہ ہو گی؟
قاسم نے بیٹی کو خوب پڑھایا۔۔ہم لوگ تو شروع سے ہی کہتے تھے کہ رشتہ ہونا مشکل ہو جائے گا۔۔۔دیکھو زیادہ لڑکی کو نہ پڑھاؤ۔
یہ زمانہ ابھی نہیں بدلا۔۔۔لوگوں کی سوچ وہی پرانی ہے۔۔۔ کہنے کو کچھ اور کرنے کو کچھ اور۔۔۔۔
زمانہ کیا بدلے گا جب ہم ہی نہ بدلیں۔۔۔۔ساری آئی گئی بس لڑکیوں کے سر ڈال دیا جاتا ہے۔۔

ہم تو اپنی لڑکی کو زیادہ نہ پڑھائیں گے۔رشتہ کہاں سے لائیں گے۔۔۔لوگوں سے یہ طعنے سنو کہ لڑکی بڑی بد قسمت ہے۔۔رشتہ ہی نہیں ہو رہا۔جیسے لڑکی کی شادی ہو جائے تو بس سمجھو کہ اس کی قسمت ہی سنور گئی۔چاہے اسے سسرال میں جہیز نہ لانے کے طعنے ہی کیوں نہ سننے پڑیں اور طعنے سن سن کر بیماریوں میں ہی کیوں نہ مبتلا ہو جائیں اور اگر اس کی پرورش اچھی ہوئی ہے تو وہ اپنی تکلیف کو اپنے مائکے والوں کو بھی نہیں بتاتی۔

لڑکی ایسی ہے لڑکی ویسی ہے۔۔۔۔ساری خرابیاں تو بس لڑکیوں کے اندر ہی ہیں۔۔۔۔
ارے ہاں کہاں کی باتیں ۔۔۔
لڑکیاں ۔۔۔لڑکیاں تو بس چہار دیواری کے اندر ہی اچھی لگتی ہیں۔
انھیں آزادی مل گئی اور یہ اپنے پیر پر کھڑی ہو گئیں تو انھیں رشتے نہیں ملیں گے۔۔۔
کنواری بیٹھی رہیں گی ۔۔۔اور عصمت چغتائی کے چوتھی کے جوڑے کی طرح مائیں صندوقچے کھول کھول کر چوتھی کے جوڑے دیکھتی

رہیں گی اور ایک دن اسی صدمے میں اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔۔۔۔

دنیا کا یہ کیسا نظام ہے کہ لوگ لڑکی کو ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔۔ یہ کہنے میں ذرا نہیں چوکتے کہ ارے بڑی بدقسمت ہے۔ اچھا بھلا رشتہ لوٹ گیا۔ لڑکی میں کوئی کمی ہوگی۔ یہ کہنے میں لوگوں کی زبان نہیں تھکتی۔

اے ہے لڑکیاں پڑھ لکھ کر کیا گھر چلائیں گی۔۔۔ ہوٹلوں سے کھانا منگا کر کھائیں گی اور گھر والوں کو کھلائیں گی۔۔۔ زمانہ بڑا خراب آ گیا ہے۔۔۔ پہلے لڑکیوں کو لوگ گھر میں ہی رکھتے تھے وہی ٹھیک تھا۔

ہم تو اپنی لڑکی کو زیادہ نہ پڑھائیں گے۔ رشتہ کہاں سے لائیں گے۔۔۔۔ لوگوں سے یہ طعنے سنو کہ لڑکی بڑی بدقسمت ہے۔۔۔ رشتہ ہی نہیں ہو رہا۔ جیسے لڑکی کی شادی ہو جائے تو بس سمجھو کہ اس کی قسمت ہی سنور گئی۔ چاہے اسے سسرال میں جہیز نہ لانے کے طعنے ہی کیوں نہ سننے پڑیں اور طعنے سن سن کر بیماریوں میں ہی کیوں نہ مبتلا ہو جائیں اور اگر اس کی پرورش اچھی ہوئی ہے تو وہ اپنی تکلیف کو اپنے مائکے والوں کو بھی نہیں بتاتی۔

ہائے رے یہ دنیا۔۔۔ لوگ جھوٹی شان کا لبادہ پہنے پھرتے ہیں۔

مگر لڑکی کو اتنی آسانی سے بدقسمت کہہ دینا کہاں کا انصاف ہے۔ لڑکیاں تو گھر کی زینت ہوتی ہیں۔

نوویلس نے ٹھیک ہی کہا ہے۔۔۔ دنیا میں بدقسمتی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بدقسمتی بالکل اسی طرح ہے جس طرح ندی کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے اور ندی جب اس رکاوٹ کو دور کر دیتی ہے تو وہ پہلے سے بڑھ کر زور و شور کے ساتھ بہنے لگتی ہے،،

عائشہ کی قسمت بھی کچھ اس ندی کی طرح تھی۔ اس نے والد سے کہہ دیا کہ ابو تعلیم بھی ہم لڑکیاں برابر حاصل کرتے ہیں۔ پھر لڑکے والوں کو لڑکے کی تعلیم کا خرچ جہیز کی شکل میں ہم کیوں دیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ اپنے آپ کو اور دوسری لڑکیوں کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچانا ہوگا ہم اپنی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔

ابو ہم نے قانون کی تعلیم بھی اسی مقصد کی تکمیل کے لیے حاصل کی ہے۔

ایک ہم ہی نہیں بلکہ اس معاشرے میں نہ جانے ایسی کتنی لڑکیاں ہوں گی۔ جو اس طرح کے مسائل سے جوجھ رہی ہوں گی کسی نہ کسی کو تو آگے آنا ہی ہوگا۔ یہ سب کچھ کب تک چلتا رہے گا۔۔۔ ابو کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اگر آپ کسی کام یا چیز کو کرنے کی قوت ارادی رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کو کر سکتے ہیں۔،،

ابو ہمیں کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہم مجبور تو نہیں۔ ہمارے اندر جوش ہونا چاہیے۔۔۔ کبھی کف افسوس نہ ملیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ کف افسوس ملنا اپنی طاقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔۔۔ ابو آپ نے ہمیں تعلیم کے لیے کبھی نہیں روکا۔ آج لاکھوں لڑکیاں ایسی ہیں جو چاہ کر بھی تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔۔۔ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔ اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں جو اس مقام تک لے جائے جہاں آپ جانا چاہتے ہیں۔

حالات کا مقابلہ ہم اکیلے کر سکتے ہیں یہ کام مشکل بہت ہے مگر ناممکن نہیں ہے اور جہیز کے بدنما داغ کو ختم نہیں تو ہلکا ضرور کر سکتے ہیں۔ جب یہ داغ تھوڑا ہلکا ہونے لگے گا تو ہلکا ہوتے ہوتے اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔۔۔ مگر اس کام کو کرنے لیے ایک لمبا وقت چاہیے۔۔۔ جب ایک بیماری کی پرواہ نہ کی جائے تو بہت ساری بیماریاں ہو جاتی ہیں اور علاج مشکل ہو جاتا ہے۔۔۔ اور آخر مریض کو آئی سی یو میں ڈال دیا جاتا ہے۔۔ ہمیں معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔۔۔۔ ابھی وقت ہے۔۔۔۔ اس جہیز نما بیماری کو آگے بڑھنے نہ دیں۔۔۔۔

کئی گھنٹے تک یہ گفتگو عائشہ اور اس کے والد کے درمیان چلتی رہی۔

آج عائشہ اپنے چیمبر میں بیٹھی تھی۔۔۔ بہت ساری فائل اس کے سامنے تھی۔۔۔۔ برسوں سے مقدمے کی پیروی کرتے کرتے یا تو ان کے والدین اللہ کو پیارے ہو گئے اور ان لڑکیوں کی عمریں بڑھ گئیں۔۔۔۔ انھیں اب اپنی زندگی ہی بوجھ لگنے لگی۔۔۔۔

عائشہ کی باتیں لڑکیاں بہت غور سے سن رہی تھیں۔۔۔۔

ع رت بدل ڈال اگر پھولنا پھلنا ہے تجھے

عائشہ نے کہا آپ سب کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔۔۔۔ اس کام میں ہماری مدد کرنی ہوگی۔ تبھی اس مرض سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہ فائل دیکھتی جا رہی تھی اور بہت روکنے کے بعد بھی آنسو کے قطرے فائل پر گرتے جا رہے تھے۔۔۔۔

لڑکھڑائے گی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے

یہ آنسو کے قطرے اس کے حوصلے کو بڑھا رہے تھے۔۔۔ اس کے منہ سے اچانک یہ جملہ نکلا کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

□□□

Dr. Nasreen Begam (Alig)
Head Dept. of Urdu
Baikunthi Devi Girls (P.G) College
Agra-282001 (U.P)

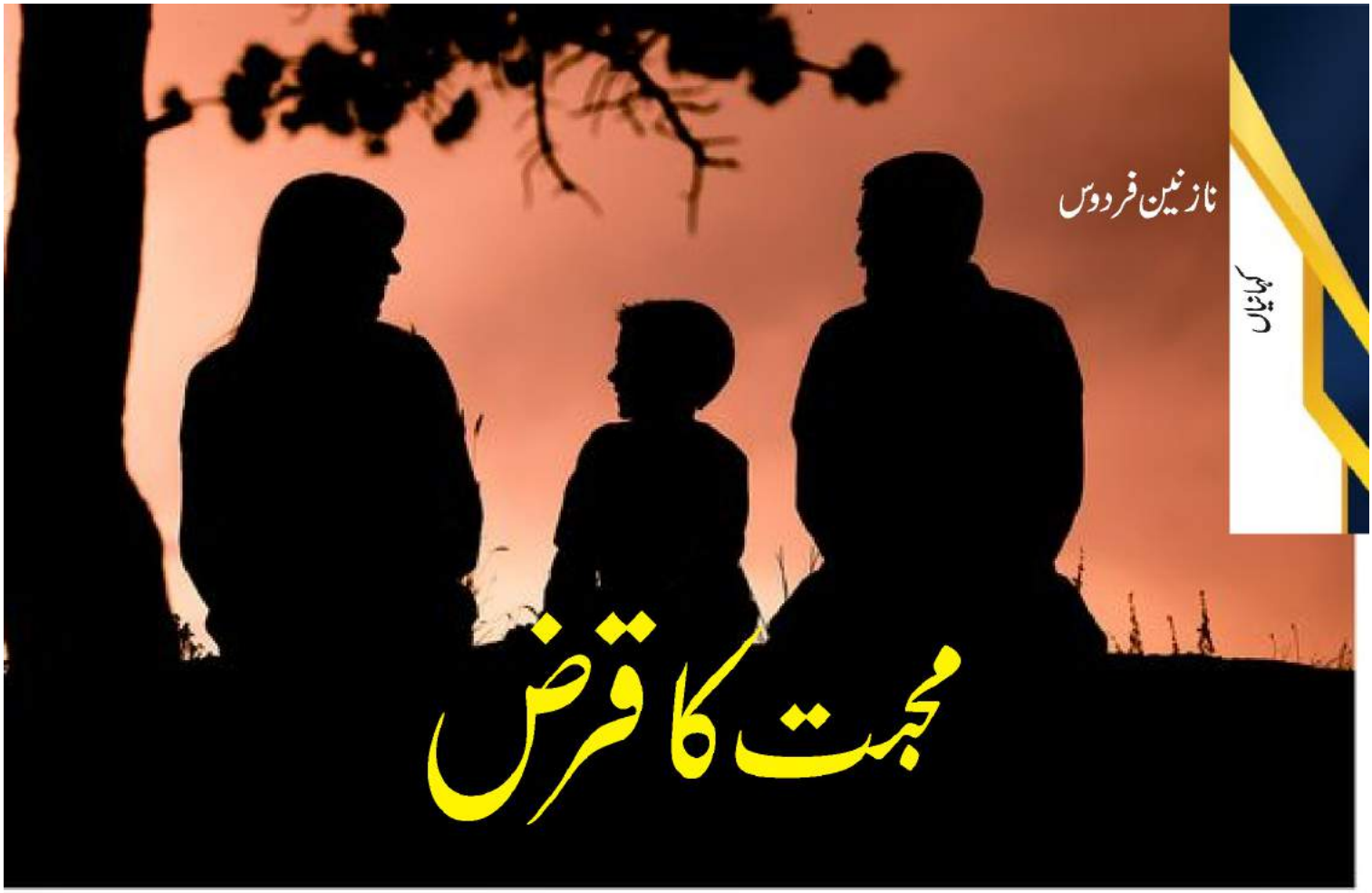

نازنین فردوس

کہانیاں

محبت کا قرض

وہ دونوں باہر آنگن میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ان کے چہروں پر کئی زمانوں کا درد بکھرا تھا۔غروب ہوتے سورج کی زرد شعائیں ان کے دکھی جھریوں بھرے چہرے پر یوں پڑ رہی تھیں جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ اس دکھ میں تم اکیلے نہیں یہ دکھ تو سورج ہر روز سہتا ہے۔ ہر چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی ہے اور۔ ڈوبتا سورج ہمیشہ تنہائی کا دکھ لے کر ڈوبتا ہے۔اس جاتے سورج کی وقعت بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ شام کا دکھ منالیا جائے۔

ڈوبتا سورج رات کا پیغام لے کر آتا ہے۔ دکھ،تنہائی،زوال کا استعارہ ہوتا ہے ڈوبتا سورج۔

اور آج اس آنگن میں ڈوبتے سورج کو دیکھتے وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔

شاید اس وقت ان کے پاس جن یادوں کا سرمایہ تھا وہ اسی ڈوبتے سورج جیسا تھا جس کی اب وقعت کچھ نہیں تھی۔ کچھ بھی نہیں۔

"دیکھو۔عمر۔ابا کو دس دن میں رکھوں گا۔اور تم امی کو دس دن رکھ لینا۔اور رہے دس دن تو وہ ثمن آپا رکھ لیں گی۔ یہ فخر صاحب کا سب سے بڑا بیٹا "بڑا" بن کر ان کا "بٹوارہ" کر رہا تھا۔اور وہ سب انھیں رکھنے کے،ان کی دیکھ بھال کرنے کے دن گن گن کر آپس میں بانٹ رہے تھے۔

"لیکن بھائی میں امی کو تو رکھ لوں گی لیکن ابا کافی غصیلے ہیں اور ان کے رویہ سے خاور بہت چڑتے ہیں"۔یہ ثمن آپا کی آواز تھی۔

"ثمن آپا۔آپ جو بھی سوچ لیں۔لیکن ابا کو رکھنا ہی پڑے گا۔یہ سب تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ہم سب بھی تو رکھ رہے ہیں۔ہم میں سے تو کوئی اعتراض نہیں کر رہا۔ہم سب کو "صبر" سے کام لینا ہے۔

"ہاں اور نہیں تو کیا۔اب امی ہی کو دیکھ لیں۔وہ کون سا خاموش رہتی ہیں۔ ہر بات میں تو انھیں کیڑے نکالنے کی عادت ہے۔یہ کرو وہ نا کرو'رزق مت پھینکو۔اتنا تیل ضائع کیوں کیا۔فلاں فلاں پکاؤ۔چاول کچے رہ گئے۔اور پھر ہر دن ان کے لیے ان کا پرہیزی کھانا بنانا۔بھئی ان کا کیا کام کم ہے۔ان کو رکھنے سے ایسی کون سی سہولت ہمیں ملنے والی ہے"۔ یہ ان کی بڑی بہو کی آواز تھی۔

فخر صاحب اور فاطمہ آنگن میں اپنی آپ کو بٹتے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ دونوں اپنی اولاد کی محبت تول رہے تھے۔وہ دیکھ رہے تھے انھیں گنا جا رہا تھا۔ان کے رکھنے کو نفع نقصان سے پرکھا جا رہا تھا۔اور وہ دونوں سر جھکائے سب سن رہے تھے۔

"میں ابا کو نہیں رکھ سکتا" عمر بولا تو وہ سب اسے دیکھنے لگے۔

"کیونکہ ابا جب جب کھانستے ہیں تو میرے بچے بے چین ہو کر اٹھ بیٹھتے ہیں اور ان کی بے چینی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ابا نا دن دیکھتے ہیں

اور نارات۔بس کھانستے رہتے ہیں۔انسان کو کچھ تو خیال ہونا چاہیے دوسروں کی نیند کا۔آرام کا۔میں امی کو جیسے تیسے رکھ لوں گا لیکن ابا کو تو میں نہیں رکھ سکتا۔"

"امی کو رکھیں گے تو ہر بات کی کٹ کٹ کون برداشت کرے گا عمر۔یہ بھی تو آپ کو سوچنا چاہیے۔اس کی بیوی نے اسے اشارہ کیا تو عمر بھی سر ہلانے لگا۔

"اس کا کیا مطلب میں فلاں کو رکھوں گا اور فلاں کو نہیں"۔ان کے بڑے بیٹے کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

"اگر عمر بھیا ابا کے لیے راضی نہیں تو میں بھی ابا کو نہیں رکھ سکتی۔وہ بہت شارٹ ٹمپرڈ ہیں۔انھیں سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔"فریحہ نے بھی اپنی رائے دی۔

ا"اس طرح تو نہیں ہوسکتا۔ہم سب کو باری باری رکھنا ہے اور بس۔اب اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی"۔بڑے نے ہاتھ اٹھا کر اپنے ماں باپ کا"فیصلہ" کیا۔

"میں تو کہوں گا کہ ماں باپ کو بوڑھے ہو کر زندہ رہنا ہی نہیں چاہیے۔ساٹھ سال کے بعد ان لوگوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔بڑی پرابلم ہو جاتی ہے"۔عمر اتنی زور سے بڑبڑایا تھا کہ باہر فخر صاحب اور فاطمہ دونوں کو بہت صاف صاف سنائی دیا تھا اور اس وقت ان دونوں کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کاش کہ وہ آج قوت سماعت سے محروم ہوتے۔کاش کہ وہ یہ سب سننے سے پہلے مر ہی جاتے۔

"اگر تم سب میری بات پر راضی نہیں تو ایک ہی راستہ بچتا ہے"۔بڑے نے ان سب کو دیکھا تو وہ سب چونک گئے۔

"اولڈ ایج ہوم۔آخری راستہ تو یہی رہ جاتا ہے"۔

بڑے کی بات پر فاطمہ گھبرا گئی اور اس نے بے ساختہ فخر صاحب کو دیکھا تھا۔وہ جو اب تک بہت ضبط کیے بیٹھے تھے۔اچانک کھڑے ہو گئے۔فاطمہ نے انھیں روکنا چاہا مگر وہ ہاتھ کے اشارے سے انھیں روکتے بہت وقار سے اندر چلے گئے۔

وہ سب فخر صاحب کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

ظفر،عمر ثمن۔مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم سب نے بہت یک جہتی کا مظاہرہ کیا اور مکمل یک جہتی سے ہم دونوں کو نبٹا رہے تھے۔ہمیں بانٹ رہے تھے کہ دس دن تم دس دن تم۔۔۔۔۔۔صحیح ہے بیٹا۔آخر حساب کتاب سکھایا بھی تو میں نے ہی تھے تو تم لوگوں نے میرا حساب کتاب چکتا کرنا چاہا۔لیکن بیٹے۔۔وہ رکے اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھے۔

"تم سب کو تو میں نے ہر حساب ہر چیز سکھائی لیکن میں اور تمھاری ماں فاطمہ بہت بھولے تھے۔ہمارا حساب بہت کچا رہا تم سب کو پالنے میں"۔وہ ہنسے۔

"ہم دونوں کو بھی اس وقت ہر چیز بانٹ لینی چاہیے تھی۔ہر چیز کا حساب رکھنا تھا۔ظفر جب تم چھوٹے تھے تو میں گھوڑا بن جاتا تھا۔اور تم میرے سوار۔اور تم میری پیٹھ پر بیٹھ کر کئی چکر لگواتے تھے۔لیکن میں بڑا بیوقوف تھا۔میں نے حساب نہیں رکھا۔مجھے ایک ایک چکر گننا چاہیے تھا جو تم نے مجھ سے کروائے۔"ان کی اس بات پر ظفر شرمندگی سے سر جھکا گیا۔

"اور بیٹے عمر۔۔۔۔۔تم تو ہم دونوں کو رات رات بھر ستاتے تھے۔نہ جانے کتنی راتیں تھیں جو ہم نے تمھیں چپ کروانے میں بغیر نیند کے گذاریں تھیں۔کاش ہم ان راتوں کو ان راتوں کے ایک ایک پل کو گن کر رکھتے۔تو ہم آج تمھیں بتاتے کہ تم پر ہماری کتنی نیند کا کتنی راتوں کا قرض چڑھا ہے اور ہم آج اس قرض کا تقاضا کرتے۔تم پر تو بس ادھار ہی ادھار ہے۔کیا کیا اور کون سا قرض اتارو گے۔اور کیا اتار سکو گے۔"ان کی سانس پھولنے لگی تو وہ رکے۔

"اور میری پیاری بیٹی۔تم تو ہماری شہزادی تھی۔ایک تمھارے چہرے پر ہنسی لانے کے لیے میں ہر دن دو گھنٹے اوور ٹائم کرتا اور ان پیسوں سے تمھاری پسند کی گڑیا لاتا۔اور تمھاری ماں راتوں کو جاگ جاگ کر اس گڑیا کے کپڑے سیتی اور تم جب صبح گڑیا اور اس کے سیے ہوئے کپڑے دیکھتی تھیں اور خوشی سے مسکراتی تھیں ناں تو بس ہماری محنت وصول ہو جاتی تھی۔ہم نے ان پلوں کا کبھی حساب نہیں رکھا۔ہم کتنے بے وقوف تھے۔ہمیں بھی ایک ایک پل کا حساب رکھنا چاہیے تھا اور تم لوگوں سے گن گن کر اس کا بدلہ طلب کرنا چاہیے تھا۔ہم نے نہیں کیا۔صد افسوس۔ہم حساب رکھتے تو آج تم سے حساب مانگ سکتے تھے۔

وہ ٹھہرے وہاں فاطمہ آ گئی تھیں۔پانی کا گلاس لیے۔ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔جبکہ وہ بڑی مضبوطی سے اپنی اولاد کے مقابل کھڑے تھے۔

"اب بس کریں۔چلیں آرام کریں۔آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"وہ انھیں اٹھانے لگیں۔

ہاں فاطمہ۔اب آرام ہی کروں گا۔لیکن آج ان سب سے اپنی محبتوں کا بدلہ گن گن کر لوں گا۔

بولو بیٹے۔میں نے صحیح کہا ناں۔حساب رکھتا یا نا رکھتا مگر قرضدار تو تم سب ہو۔ہمارے۔بولو بیٹے۔کیا ہمارا قرض ادا کر سکو گے"۔ان کی

بارعب آواز پر وہ سب لرز گئے۔ان کے سر جھک گئے۔

کوئی اولاد اپنے والدین کا حق ادا ہی نہیں کرسکتی۔میرے حضور کا فرمان ہے۔غور سے سن لو

ساری عمر ماں کو اپنی پیٹھ پر گرم ریت میں چل کر اسے حج کرواؤ تب بھی ماں کی اس چیخ کا حق ادا نہیں کر سکتے جو درد زدہ میں اس سے نکلی تھی"۔ان کی آواز بھرا گئی۔

اور باپ جنت کا دروازہ ۔۔۔

اور اب تم ہمیں اولڈ ایج ہوم میں بھیجنا چاہتے ہو جہاں کچھ ماہانہ پیسے دے کر تم ہمارے حقوق ادا کرو گے۔واہ۔میرے بچو واہ۔

اولڈ ایج ہوم میں اپنے باپ کو داخل کرو گے تو جنت میں جانے کے لیے جنت کا دروازہ کیسے پاؤ گے۔"

ان کی بات پر وہ سب ٹھنڈے پڑ گئے۔

"ابا جی۔ابا جی ہمیں معاف کر دیں"۔وہ سب روتے روتے باپ کے قدموں میں گر گئے تھے۔

سچ ہے۔جہاں والدین اپنی اولاد پر انمول محبت لٹاتے ہیں۔

وہاں۔۔۔۔۔۔

اولاد والدین پر اپنی محبت گن گن کر لٹاتی ہے۔

دونوں کی محبت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

یہ ہر دور کا المیہ ہے۔

□□□

Naazneen Firdose
8-15-70/3/1,
Mohammedia Colony
Vattepally, Falaknuma
Hyderabad-500053.(T.S)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر..... .....بتاریخ.....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC:CNRB0019009،A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

نیند کی گولیاں

شمیمہ صدیق شمی

یادیں اُسے زہریلی ناگن کی طرح ڈس رہیں تھیں ۔ اپنے معصوم بھائی کا چہرہ بار بار آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا اور وہ شدتِ کرب سے تڑپ اُٹھتا تھا۔ والدین کے سامنے مضبوطی کا خول چڑھائے رکھتا اور جوں ہی تنہا ہوتا تو یادوں کے دریچے کُھل جاتے اور ساتھ ہی زخموں کے ٹانکے بھی کُھل جاتے، تنہائی میں اسے آنسو بہانے کا موقع مل جاتا اور وہ تنہائی میں خوب روتا۔ اُسے اپنا بھائی بہت عزیز تھا وہ دونوں بھائی ایک دوسرے کی جان تھے، وہ دونوں صرف بھائی ہی نہیں اچھے دوست بھی تھے۔ عمر اپنے بھائی شاہد سے تین سال بڑا تھا۔ دونوں میں بے حد محبت تھی ۔ ساتھ ساتھ بڑے ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمی سفر جاری رکھا۔ ایک شام اِن پر قیامت ٹوٹ پڑی، دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا تو عمر کی ماں باہر آئی، دیکھا کہ تین چار نقاب پوش آدمی کھڑے تھے

"اندر کون ہے" ؟ نقاب پوش آدمیوں میں سے ایک بولا۔

" جہ جہ جی، میرا شوہر اور بیٹا ہے اندر" عمر کی ماں ڈرتے ہوئے بولی

"بلاؤ ان کو باہر" دوسرا اگرجدار آواز میں بولا۔

وہ بیچاری ہانپتی کانپتی اندر گئی اور ان کو باہر کی حالت سے آگاہ کیا۔ عمر گھر میں نہیں تھا اُس دن ۔ شاہد اور اس کا باپ دونوں ڈرتے ہوئے باہر آئے۔

"اچھا تو یہ تمھارا بیٹا ہے"؟ ایک نقاب پوش آدمی بولا

"جی جی صاب" وہ بیچارہ گھبرایا ہوا بولا

" کتنے لوگ رہتے ہیں تمھارے گھر میں؟"

"جی ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارے دو بیٹے"

"دوسرا بیٹا کہاں ہے؟"

"جی وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے" وہ کانپتے ہوئے بولا۔

"اچھا! ہوں" اس نقاب پوش آدمی نے دوسرے کو کچھ اشارہ کیا اور اس نے آکر شاہد کی بازو پکڑ لی

"چلو ہمارے ساتھ" وہ اُسے گھسیٹتا ہوا بولا

" کہاں؟، کیوں؟ چھوڑو مجھے" وہ معصوم خود کو چھڑاتے ہوئے بولا

"تمھیں کس نے اجازت دی، سوال جواب کرنے کی،؟ چلتا ہے سیدھی طرح کہ دو چار لات گھونسے کھائے گا۔" نقاب پوش غصے سے بولا

نہیں نہیں، آپ میرے بیٹے کو نہیں لے جاسکتے، آخر اس کی کیا غلطی ہے،؟ کیا قصور ہے میرے بیٹے کا؟" وہ زار و قطار روتے ہوئے بولی

"یہ آپ لوگ میرے بیٹے کو کہاں لے کر جا رہے ہیں؟" اس کا باپ بے بسی سے دُکھی لہجے میں بولا۔ مگر اِن ظالموں نے اس بے بس ماں

باپ کے آنسوؤں پر کوئی دھیان نہ دیا اور ان کے بیٹے کو ساتھ لے کر چلے گئے، وہ دونوں میاں بیوی روتے بلکتے رہ گئے، آہ وزاری کرتے رہ گئے۔ عمر جب گھر پہنچا تو ساری بات سُن کر کلیجہ تھام کر رہ گیا۔

" آپ نے چھوٹے کو کیوں ان ظالموں کے ساتھ جانے دیا؟" وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"ارے ہم ان ظالموں کے آگے بے بس ہو گئے تھے، کیا کر سکتے تھے، نہ جانے کہاں ہوگا میرا بیٹا" ماں روتے ہوئے بولی۔

تینوں نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر شاہد کا کوئی پتہ نہ چل سکا اور تیسرے دن اُس کی لاش کسی سیب کے باغ میں ملی، لاش جب گھر پہنچی تو قیامت ٹوٹ پڑی، ایک کہرام سا مچ گیا، وہ دونوں میاں بیوی تو جوان بیٹے کی لاش دیکھ جیتے جی مر گئے، کوئی ہوش نہ رہا، جوان اولاد کی موت کا غم انھیں زندہ لاش بنا گیا۔ عمر خود اندر سے ٹوٹ کر بکھر گیا تھا مگر اپنے والدین کو تسلی دیتا رہتا۔

" ماں آپ نہ روئیں زیادہ، آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، شاہد کی عمر اتنی ہی لکھی گئی تھی، اس کا دانا پانی یہی تک لکھا ہوا تھا" وہ آنسوؤں کو پلکوں کی دیوار کے پیچھے دھکیلتا ہوا بولا۔

"بیٹا مجھے صبر ہی نہیں آتا ہے، اپنے اس بے قرار دل کا کیا کروں؟، میرے معصوم بے گناہ شاہد کو اتنی بے دردی سے کیوں مارا گیا،؟ آخر کیا قصور تھا میرے معصوم بچے کا؟" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

عمر نے ماں کو گلے لگا لیا۔

" نہ رو ماں نہ رو، آپ اس طرح روتی ہیں تو میرا دل مجھے کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے" وہ آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

"وہ قاتل ظالم لوگ بھی میری طرح تڑپیں" وہ تڑپ کر ظالموں کو بددعا دینے لگی۔

" ظالموں کو ایک نہ ایک دن ضرور سزا ملے گی ماں" وہ روندھے ہوئے گلے سے بولا۔

عمر ماں باپ کی حالت دیکھ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ ماں کی حالت دیکھ اُسے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ بھائی کی یاد اک پل بھی دل سے جدا نہیں ہوتی تھی۔ رات کی تنہائی میں اپنے بھائی کی یاد اسے زیادہ ستانے لگتی۔ اُس کی کمرے میں رکھی گئی چیزیں اسے بے چین کر دیتیں، دونوں بھائیوں کا کمرہ مشترکہ تھا۔ کمرے کی اک اک چیز دیکھ کر معصوم شاہد کی یاد آنے لگتی۔ مسلسل رتجگوں کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ سر درد اس کا ساتھی بن کر رہ گیا تھا۔ سر درد کی کتنی گولیاں لیں مگر بے کار۔

''اف، سر درد سے پھٹا جا رہا ہے، کاش چند پل کی ہی مجھے نیند آجاتی تھوڑا افاقہ ہو جاتا" وہ سوچنے لگا۔ مگر نیند تو مدت ہوئی اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ بھائی کی جدائی میں نیند بھی اسے کوسوں دور ہو گئی تھی۔ ماں باپ کی حالت دیکھ وہ خود دن میں کتنی بار ٹوٹتا پھر دُکھی زخمی دل پر صبر کے مرہم لگاتا، مگر دُکھ جب دل میں سرایت کر جاتا ہے تو دل کو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا کہ میرے سوا اِن کا کون ہے تو مضبوطی کا خول خود پر چڑھا لیتا ،دل اندر سے تار تار تھا، پھر بھی وہ اپنے ماں باپ کو تسلیاں دیتا رہتا۔ انھیں سمجھاتا رہتا کہ موت کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔

شدتِ کرب سے وہ تڑپ رہا تھا تو اُسے یاد آیا اُس کی ماں نیند کی گولیاں لیتی ہے، جو کہ ڈاکٹر نے آرام کے لیے دیں تھیں ،اس نے سوچا آج وہ بھی نیند کی گولی لے لے، نیند سے تھوڑا آرام آجائے گا، مسلسل رتجگے کی وجہ سے جو سر درد ہے، ہو سکتا ہے اس میں کمی آجائے ، یہ سوچ کر وہ والدین کے کمرے میں گیا اور دراز سے نیند کی گولیاں نکالنے لگا۔ اس کی نظر ماں کے چہرے پر پڑی، کس قدر کرب زدہ چہرہ ہو گیا تھا ماں کا، وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہو گئی تھی۔ وہ ماں کے قریب گیا، مگر یہ کیا، ماں گہری نیند میں ہوتے ہوئے بھی آنسوں بہا رہی تھی۔ آنسو دھیرے دھیرے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ عمر یہ دیکھ تڑپ اُٹھا، اس نے سوئی ہوئی ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ چوم لیا۔ یہ مائیں کتنی پیاری ہوتیں ہیں، اپنی اولاد کو نیند میں بھی نہیں بھلا سکتیں۔ دواؤں کے زیر اثر بھی ماں بیٹے کی جدائی میں آنسو بہا رہی تھی۔ ماں کی یہ حالت دیکھ اُسے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا، اسے ایسا لگا کوئی تیز دھار چاقو سے اس کا دل سینے سے نکال رہا ہے۔ والدین کی حالت کا دُکھ، بھائی کی جدائی کا غم اور مسلسل رتجگے کی وجہ سے اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا، دُکھ اور درد کی وجہ سے بے دھیانی میں وہ ایک گولی کی جگہ نہ جانے کتنی گولیاں نگل بیٹھا اور مشکل سے اپنے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر ڈھ گیا۔ صبح جب ماں جگانے گئی تو عمر کی عمر مکمّل ہو چکی تھی اور وہ نیند کی گولیاں زیادہ مقدار میں لینے کی وجہ سے ہمیشہ کی نیند سو گیا تھا۔

□□□

Shameema Sidiq
Shopian
kashmir-192303 (J & K)
Mob:9682124761

غزلیں

رخشاں ہاشمی

اُس نے کھولا خوشی کا دروازہ
مجھ پہ یہ شاعری کا دروازہ

ایک بس آپ ہی مرے محسن
مجھ پہ وا آپ ہی کا دروازہ

شہرِ اُلفت میں داخلہ تو ہے
بند ہے واپسی کا دروازہ

اے خدا تُجھ سے اِلتجا میری
کھول دے بندگی کا دروازہ

دَستکیں اس نے دیں درِ دل پر
کُھل گیا عاشقی کا دروازہ

گُھپ اندھیرے ہوئے تمام آخر
آ گیا روشنی کا دروازہ

بند ہیں سارے مجھ پہ دروازے
ہے کُھلا بس اُسی کا دروازہ

یہ بھی منظر عجیب منظر ہے
کوئی کھولے کسی کا دروازہ

نام رخشاں ہے اُس کا شہرِ اماں
نہ کُھلے پر کِسی کا دروازہ

Rakhshan Hashmi
Hashmi Maskan
Shah Zubair Road, Rizvi Colony
Munger-811201(Bihar)
Mob:9304342562

شہناز رحمت

مجھے عشق میں نارسائی نہ دے
مرے پیار کو تو جدائی نہ دے

مرا غم ہے سارے جہاں پے نمایاں
تجھے دیدہ ور کیوں دکھائی نہ دے

مرا ہم سفر بن میرے ساتھ چل اب
مجھے بے وجہ کی صفائی نہ دے

میرے حصے میں جو ہے دے مجھ کو مولا
مجھے چیز کوئی پرائی نہ دے

ہیں دنیا میں سب کے ہی اپنے پرائے
مجھے کوئی اپنا دکھائی نہ دے

ملاقات کی گر تمنا ہے دل میں
مجھے فاصلوں کی دہائی نہ دے

مرے سر پہ چادر رہی ہے حیا کی
تو تہذیب کی اب دہائی نہ دے

ادب جس میں شامل نہ ہو بزرگوں کا
تو شہناز کو وہ پڑھائی نہ دے

Shahnaz Khatun
Swayamsiddha
Room No 102, IA Market Road
Sector 3, Salt lake
Kolkata-700097 (West Bengal)
Mobile:8013055406

ذاکرہ شبنم

نظم

تاج محل کو دیکھ کر

1-اللہ اللہ لاجواب ہے اُس کا فسوں
دیکھ کر اُسے یاد آتا ہے افسانۂ عشق وجنوں
دو محبت بھرے دلوں کی یہ لگن
کہ خوابیدہ ہیں سنگِ مرمر کے تلے اوڑھ کر کفن
ایسا لگتا ہے یاد میں ممتاز کی
شاہجہاں کی آنکھ سے ٹپکا ہر آنسو
تاج کے منقش در و دیوار میں ہے ضم
اک شہنشاہ کی محبت و ذہانت کا یہ ہے ثمر

2-بھول سکتی نہیں میری آنکھیں
مرحبا یہ حُسن و الفت کی نشانی
دہر بھر سے بے شمار عُشاق آتے ہیں یہاں
چاندنی راتوں میں ہاتھوں میں ہاتھ لیے
تاج کے سائے تلے عہد و پیمان کیے
نہ کوئی خواب نہ تصور نہ تخیل ہے یہ
حقیقت سے بھرپور زندہ علامت ہے یہ
تاج محل محبت بھرے دلوں کا ہے مظہر

3-بھلا پاؤں نہ کبھی وہ سہانہ منظر
آنکھوں میں پنہاں وہی پر کیف سماں ہے
تاج کی آغوش میں آ کے محبت بھرے دل
یقیناً لمحوں میں صدیاں جی لیتے ہیں
بھلا پائے گی نہ دنیا کبھی یہ بے مثال شاہکار
سفید سنگِ مرمر لگتا ہے کتنا سادہ و پرکار
عالمی عجائب میں ہوتا ہے اس کا شمار
آفریں یہ حسن و عظمت ہندوستاں کی عطا ہے
سارے جہاں میں یہ حسیں تاج محل
ہے لائقِ دید و یادگار.....!!!

Zakira Shabnam
C/O-Riyaz Ahmad, R-S- Foot Wear
Shop-No-192,M-G Market
Robertsonpet-K-G-F
Distt.Kolar-563122 (Karnataka)
Mob:9916969954

تھائرائیڈ (THYROID) اور خواتین

ڈاکٹر بشریٰ اشرف

2012 کے ایک سروے کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہندوستان میں تھائرائیڈ کے امراض میں مبتلا مریضوں کی تعداد 4.2 کروڑ تھی۔ موجودہ حالات کے پس منظر میں یہ کہنا شاید بجا ہوگا کہ یہ بیماری تب سے بہت بڑھ گئی ہے اور پھیل بھی رہی ہے۔ آج سے لگ بھگ ایک دھائی قبل یہ کہا جاتا تھا کہ ہر 10 اشخاص میں سے ایک شخص اس مرض میں مبتلا ہے جو ایک اچھی خاصی تعداد اور تناسب تھا۔ امریکہ کی کل آبادی میں 1.2% اشخاص تھائیرائیڈ کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ خواتین میں ،مردوں کے مقابلے میں دو سے دس گنا چانسز زیادہ ہوتے ہیں اس بیماری میں مبتلاء ہونے کے۔ یہ بیماری جانوروں، خاص طور پر پالتو جانوروں میں بھی ہوسکتی ہے۔

تھائیرائیڈ کے امراض میں مبتلا مریضوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان میں تقریباً ایک تہائی اشخاص یہ نہیں جانتے ہیں کہ وہ اس مرض میں مبتلا ہیں، اس حد تک اپنے مرض سے لاعلمی اور غفلت کے کئی وجوہات و اسباب ہوسکتے ہیں جو ایک الگ موضوع ہے۔ یہاں اس کی وضاحت ممکن نہیں ہے۔

اوپر مذکورہ سروے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تھائیرائیڈ کے مسائل عام طور پر عورتوں میں اس لیے بھی پائے جاتے ہیں کہ حمل ٹھہرنے اور بچے کی پیدائش سے قبل تین مہینوں کے دوران تقریباً 44% خواتین کو تھائیرائیڈ کے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔

تھائیرائڈ کے اعمال و افعال:۔ تھائیرائیڈ گردن کے اگلے حصے، گلے کی طرف، تتلی نما ایک غدود ہوتا ہے جو انسانی جسم میں موجود مختلف غدود کی طرح ہی کام کرتا ہے۔ اس کا اہم کام ایسے ہارمونز پیدا کرنا ہوتا ہے جو اعضائے رئیسہ میں سے، دل اور دماغ اور جسم کے دیگر اعضاء کو صحیح اور نارمل طریقے سے چلائے اور کام کرائے۔ یہ جسم کو توانائی کا استعمال کرنے کے قابل بناتا ہے اور اسے توانا و گرم رکھتا ہے اگر یہ غدود کم یا زیادہ ہارمونز پیدا کرے اور بنائے تو اس کہ یہ بے اعتدالی، اور توازن نہ رہنے سے، انسانی جسم میں تھائیرائیڈ سے متعلق بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔

تھائیرائیڈ کی بیماریاں:۔ جب تھائیرائیڈ جسم کے حسبِ ضرورت ہارمونز پیدا کرنے میں اعتدال نہیں رکھ پاتا تو تھائیرائیڈ کی بیماریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ جیسے ہائپو تھائیرائیڈزم کی بیماری۔ اس میں مریض کا جسم پہلے کی طرح متحرک اور چاک و چوبند نہیں رہتا اور جلد تھک جاتا ہے یہ ایک علامت نمایاں دیکھنے میں آتی ہے دوسری متعلقہ علامات بھی ظہور میں آ جاتی ہیں۔ اس بیماری یا بگاڑ سے جسم میں تھائیرائیڈ سے ٹرائی آئیوڈین تھائیروکسین یعنی T-4 ہارمونز کی پیداوار و اخراج کم ہو جاتا ہے اس طرح

سے تھائیرائیڈ سٹیمولیٹنگ ہارمون TSH بڑھ جاتا ہے۔

اگر یہ غدود اعتدال سے زیادہ ہارمونز پیدا کرنے لگے تو اس مسئلے کو ہائپر تھائیرائیڈزم کہا جاتا ہے اس سے مریضوں کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کوئی نشہ کرنے سے ہوتی ہے۔ اس طرح کے مسائل تھائیرائیڈ گلینڈ کی پیداوار سے متعلق تھے کہ اگر یہ کم ہارمونز بنائے یا پھر اعتدال سے زیادہ تو دونوں صورتوں میں توازن کے بگڑنے کو مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے جبکہ حالتِ صحت میں ایسا نہیں ہوتا۔ تیسری صورت تھائیرائیڈ گلینڈ کی سوجن ہے جسے GOITRE کہتے ہیں جس میں گلہ سوجھ کر باہر نکل آتا ہے۔ کچھ اور خلقی خرابیاں بھی ہیں۔

تھائیرائیڈ کے عام امراض کی علامات:۔ ہائپو تھائیرائیڈزم (Hypothyriodsm) تھائیرائیڈ گلینڈ میں ورم یا سوجن وغیرہ سے لاحق ہوسکتا ہے، اس میں تھائیرائیڈ گلینڈ میں کوئی خلقی خرابی یا نقص پیدا ہوسکتا ہے یہ بیماری ریڈیو آیوڈین تھراپی (Radioiodine Therapy) سے اور بہت زیادہ آیوڈین کا استعمال بھی اس کا ایک کارن ہوسکتا ہے۔ کچھ مخصوص دوائیاں بھی تھائیرائیڈ کی بیماریاں پیدا کرسکتی ہیں، اور کچھ دیگر اعضاء یا غدد کی بیماریاں جیسے Pituitary adenoma وغیرہ، علامات میں، وزن بڑھنا، کمزوری، سستی اور کاہلی، نیند کا غلبہ، سردی لگنا، خواتین کی ماہواری میں بے اعتدالی، بالوں کا گرنا، حمل ٹھہرنے میں دشواری وغیرہ علامات پیدا ہوجاتی ہیں۔ جبکہ ہائپر تھائیرائیڈزم (Hyperthyriodsm) T-3,T-4 کی جسم میں حد سے زیادہ پیدائش اور مقدار جمع ہونا اور TSH (Thyroid Stimulant Hormone) کے بڑھ جانے سے یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی خاص خاص علامات میں، Nervousness,Irritability، پسینہ زیادہ آنا، دھڑکن کی زیادتی، ہاتھوں بازوں وغیرہ کی تھرتھراہٹ، فکر و تشویش، نیند میں خلل، جلد کی حساسیت، بالوں کا گرنا یا ٹوٹنا، پٹھوں کی کمزوری، خاص طور پر بازوؤں اور رانوں کے، پاخانہ بار بار آنا، دست لگنا، وزن گھٹ جانا اچھی خاصی بھوک کے باوجود بھی، جبکہ 10% مریضوں کا وزن بڑھنا بھی شامل ہے، متلی یا قے، گرمی کا برداشت نہ ہونا، کمزوری کاہلی اور سستی، خون میں شوگر کی مقدار کا بڑھ جانا، پیاس اور پیشابوں کی زیادتی، بے چینی، ہاتھ پاؤں میں کپکپاہٹ اور گرمی کا احساس، موڈ میں تبدیلی، بہت کم مریضوں میں بینائی کا کمزور ہونا، خواتین میں ماہواری کی بداعتدالی وغیرہ،

ہڈیوں کی کمزوری جس میں Fracture کا بھی رسک بڑھ جاتا ہے خاص طور پر ان خواتین میں جن کی ماہواری قدرتی طور پر رک گئی ہو، Osteoporosis کا بھی خطرہ رہتا ہے یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ تھائیرائیڈ کی بیماری کو Autoimmune Diseases کے ضمرے میں بھی رکھا گیا ہے۔ جس کا مکمل علاج تو نہیں ہے ہاں البتہ کنٹرول ممکن ہے۔

احتیاطی تدابیر:۔ موجودہ دور میں طرزِ زندگی کو بدل کر بھی

تھائیرائیڈ کی عام نوعیت کی بیماریوں کو کنٹرول کیا جانا ممکن ہے۔ متوازن خوراک لینا بہت ضروری ہے۔ جس میں پھل، سبزی، انڈے، دودھ بہت اہم ہیں۔ فاسٹ فوڈ اور ڈبہ بند چیزوں سے پرہیز ضروری ہے۔ ورزش وغیرہ سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔

آیوڈین (Iodine) تھائیرائیڈ گلائینڈ کے لیے بہت ضروری ہے جو ہارمونز بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اور ایک دھات سیلینیم (Selenium) تھائیرائیڈ کے انزائیمز کو متحرک کرتا ہے، یہ چاول، مچھلی، گوشت اور سبزی وغیرہ میں ہوتا ہے وہ کاربوہائیڈریٹس جن میں فائبر زیادہ ہو جو ان سبزیوں اور پھلوں میں ملتا ہے کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ہائپو تھائیرائیڈزم میں میٹابولزم کی درستگی کے لیے جاگنگ، تیز چہل قدمی، آہستہ دوڑنا، مناسب کھیل کود اور ورزش فائدہ مند رہتی ہے اور اس کی صلاح دی جاتی ہے۔ اچھی اور اطمنان بخش نیند سے بھی آرام رہتا ہے۔ عام طور پر پالش کئے ہوئے چاول، ریفائینڈ آٹے اور ڈبہ بند خوراک سے پرہیز کی صلاح دی جاتی ہے۔

تھائیرائیڈ کو متحرک کرنے والے ہارمون شامل ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ تھائیرائیڈ ٹھیک ٹھاک سے کام کر رہا ہے تھائیرائیڈ پروفائیل ٹیسٹ کیا جاتا ہے اس کی مدد سے خون میں TSH, T-4, T-3 جیسے ہارمونز کی سطح چیک کی جاتی ہے۔ اگر یہ نارمل سطح سے کم یا زیادہ ہوں تو پھر علاج کرانا لازمی بن جاتا ہے۔ زیادہ تھائیرائیڈ ہارمون کی پیدائش Thyrotoxicosis بھی پیدا کر سکتا ہے۔

حاملہ خواتین اور تھائیرائیڈ:۔ دورانِ حمل TSH کی سطح بڑھ سکتی ہے۔ اگر سطح بڑھ گئی ہو تو علاج کرانا ضروری بن جاتا ہے۔ ماہر معالجین کا خیال ہے کہ اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو اسقاطِ حمل کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس حالت میں ڈاکٹر ہر چھ ہفتے بعد TSH کی لیول چیک کرانے کے لیے بتاتے ہیں۔

پیچیدگیاں:۔ بعض اوقات عدم توجہی اور لاپروائی سے ذہنی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں ہائپو تھائیرائیڈزم کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز یا کم ہو سکتی ہے۔ اگر یہ حالت مستقل رہی تو دل کی بیماریاں پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ اس حالت میں جسم میں سوڈیم کی سطح نیچے چلی جاتی ہے جس سے مریض کوما میں جا سکتا ہے اگر بچوں کی پیدائش کے بعد، ان میں موجود اس بیماری کی تشخیص وقت پر نہ ہو سکی تو ایسے بچوں کی ذہنی نشوونما رک سکتی ہے اور ان کا آئی کیو لیول کم ہو سکتا ہے۔

ان سب مسائل کا علاج ممکن ہے۔ اس لیے فوری توجہ سے معاملات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر چھوٹے بچوں میں، ان کا مستقبل خطرے میں پڑنے کے بغیر ہی، ان کی نشوونما کو درست سمت کی طرف گامزن رکھا جا سکتا ہے اور اگر وقت پر توجہ نہ دی گئی تو یہ سنگین صورت حال بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

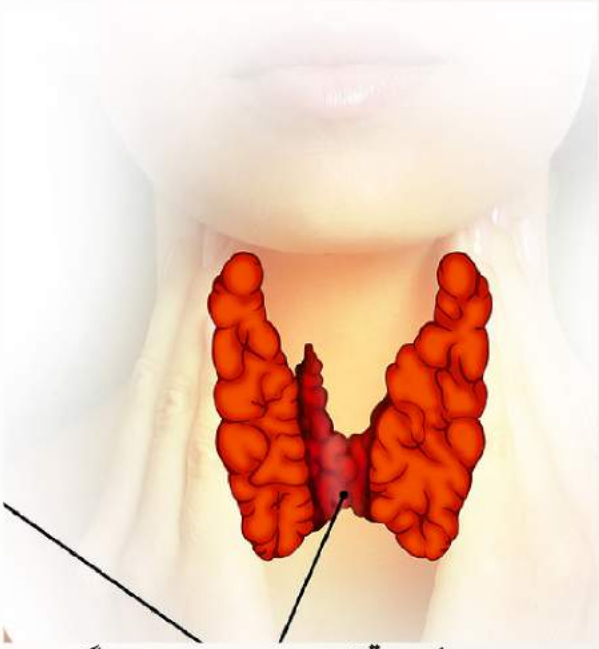

تھائیرائیڈ کینسر:۔ تحقیق کے دوران یہ بات سامنے آگئی ہے کہ 100 خواتین میں سے 4 خواتین کو تھائیرائیڈ کینسر ہوتا ہے۔ تھائیرائیڈ گلائینڈ میں چند خلیوں کے مسلسل بڑھتے رہنے سے تھائیرائیڈ کا کینسر پیدا ہوتا ہے۔ اگر بر وقت اس کا پتہ چل جائے تو اس کا علاج ممکن ہے۔ Thyroid کا Scan اور خون وغیرہ کی جانچ سے اس کا پتہ چلایا جاتا ہے اور پھر کس مرحلے میں، Radioiodine Therapy, Medicines & Surgery, اور Synthetic Thyroid Hormone سے علاج ممکن ہے یہ طے کیا جاتا ہے۔

تھائیرائیڈ کینسر کی علامات میں گلے میں گانٹھ، تنگئ تنفس، نگلنے میں دشواری وغیرہ اہم علامات ہیں۔ یہ سرطان مختلف عمر والے مریضوں میں ہو سکتا ہے، مرد اور خواتین دونوں اس کے شکار ہو سکتے ہیں۔

□□□

Dr.Bushra Ashraf
Sudrabal,Hazratbal
Srinagar-190 006(Kashmir)
Cell:-7780836240

مراسلہ

''خواتین دنیا'' ستمبر 2023 نظر نواز ہوا۔ اتنے سارے روشن چاند مہر ورق کو تابدار کر گئے اور نگاہوں کو مسرور کر گئے کہ ہندوستانی خواتین بھی ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں۔

اس شمارے کے ابتدائی نقوش میں بھی خلائی تحقیق میں خواتین کے انہماک کی پذیرائی اور انھیں حوصلہ دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس شمارے میں کوئی آٹھ اصناف سخن اور ان کے ذیل میں تقریباً 18 مندرجات سے چار چاند لگ گئے ہیں۔ ''جہانِ نسواں'' میں کوئی دس مقالات شامل ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ بعنوان ''اُردو افسانے میں نسوانی کردار'' جناب ابراہیم نثار اعظمی نے لکھا ہے جس کی شروعات چار حوالہ جاتی کتب کی مدد سے کی گئی ہے اور قصہ کہانی کی ابتدا سے افسانوں میں نسوانی کردار تک پہنچے ہیں۔ افسانوں اور داستانوں کی طوالت اُس دور کی باتیں ہیں جبکہ لوگوں کے پاس فرصت کے فاضل اوقات میسر تھے۔ لیکن جب مشینی دور کا دور دورہ ہوا تو فرصت ہوا ہوگئی۔ اس لیے داستانوں کی جگہ افسانوں نے لی کیوں کہ یہ مختصر ہوتے تھے اور کم وقت میں انھیں پڑھا جاسکتا تھا۔ مصنف نے بڑی طویل تمہید باندھی، کئی افسانوں اور کتب کے حوالے دیئے۔ افسانے اور ناول خلط ملط ہوگئے۔ ناولوں اور افسانوں میں کرشن چندر سے لے کر نذیر احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ میں سے کسی نسوانی کردار سے متعلق نہ کچھ لکھا ہے اور نہ ذکر کیا ہے۔ یعنی اس میں مقالہ کے عنوان کے مطابق موضوع کا فقدان ہے جو کہنا چاہتے تھے وہی نہ کہہ سکے۔ ڈاکٹر آفرین شمّر نے ''ابن کنول بحیثیت خاکہ نگار'' لکھا ہے۔ ابن کنول ایک معروف ادیب ہیں۔ مصنفہ نے ان پر عمدہ مضمون تحریر تو کیا ہے مگر یہ اقتباسات سے معمور ہے۔ ''اردو ادب میں چہار بیت کا تاریخی اور سماجی پس منظر'' ڈاکٹر گلشن مسرت کا لکھا ہوا پڑھنے کے لائق بہت خوب مضمون ہے۔ دراصل قابل مصنفہ پیش کشی کا ہنر جانتی ہیں کہ قاری کو کیسے باندھے رکھیں کہ چہار بیت لوک گیت کی ایک شکل ہے اور کہ پٹھانوں نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ لوک گیتوں کے اتار چڑھاؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفہ نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں یہ صنف سخن پشتو سے اردو میں وارد ہوئی اور یہ کہ فیض اللہ خاں نے 1774 میں اس کی ترویج میں حصہ لیا۔ پٹھان جب ہندوستان آئے تو روہیل کھنڈ کی فوجی چھاؤنیوں میں اس مردانہ رقص کو پیش کیا پھر چہار بیت کی ہیئت کی وضاحت کی گئی۔ پھر ہندوستان بھر میں اس کا رواج بڑھتا گیا۔ آخر میں اس کی مثالیں دی گئی۔ عزہ معین نے ''محبت کی مورت: اسّو پھوپو'' لکھا ہے جس میں گھریلو رشتہ داری کے واقعات ہیں پڑھ لیجیے۔ لکھنوی تہذیب و ادب پر دو اچھوتے مضامین ''دبستان لکھنؤ کی چند مرثیہ نگار خواتین'' اور دوسرے ''لکھنؤ کی چند اہم شاعرات بالترتیب محترمہ رانی حفیظ اور ڈاکٹر الطاف احمد میر نے لکھا ہے بقیہ مضامین بھی پڑھنے کے لائق اور قابل تعریف ہیں۔ ''نکہت سخن'' میں بڑے دلنواز اشعار دیئے گئے ہیں خصوصاً شاکرہ پروین اور صبیحہ صبا کے اشعار قابل تعریف ہیں۔ ''سائنس میں خواتین'' کے تحت ''سائنس میں مسلم خواتین'' ڈاکٹر روبینہ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ڈاکٹر حمیدہ سیدہ ظفر ماہر امراض چشم اور پروفیسر قمر رحمان مارہ نینو پارٹیکلز کے کارنامے کوئی بارہ انگریزی حوالہ جات کی مدد سے پیش کیے ہیں۔ جبکہ آسیہ خان نے ''خلائی افق کا آفتاب ہیں خواتین'' لکھ کر گویا کور اسٹوری پیش کردی۔ ''حسن سخن'' میں ڈاکٹر ہاجرہ خاتون نے دو معریٰ نظمیں پیش کر کے دل کو تکلیف دہ احساس دلایا ہے۔ ڈاکٹر عنبر عابد اور محترمہ میمونہ تحسین نے بھی اچھی غزلیں پیش کی ہیں۔ ''افسانہ'' کے تحت دو افسانے شامل ہیں۔ ایک تو ''رشتوں کی مہک'' ڈاکٹر نغمہ جاوید ملک کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک گھریلو افسانہ ہے۔ اگر آپ کو ایسے موضوعات میں دلچسپی ہے تو ضرور پڑھیے۔ دوسرا افسانہ ''حیات الفت'' کا دبیز پردوں میں لکھا ہوا افسانہ ہے۔ یہ دبازت کے پردے مہین ہوجاتے تو بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی۔ ''صحت'' کے تحت ڈاکٹر خان شہناز بانو نے ''قبل از وقت مینو پاز'' لکھا ہے جو تمام تر خواتین سے متعلق ہے۔ ''مراسلہ'' کے ذیل میں محترمہ شبینہ بیگم کا مراسلہ درج ہے۔

اس پرتکلف و پر بہار نگارنامہ سے متعلق دل کی گہرائیوں میں یہ شعر دھڑکنے لگا۔ فیض

تمھارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمھاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، بی-II، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

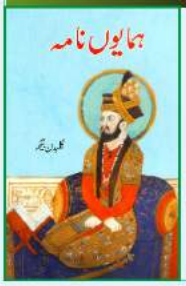

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

مصنف: محمد حسن، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو- ہندی لغت

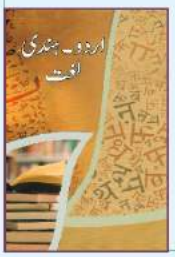

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبیعیہ

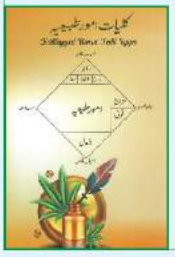

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

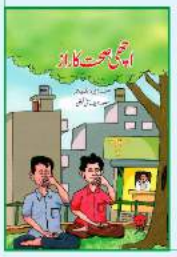

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, नवम्बर - २०२३वर्ष:७, अंक: ११
Mahnama Khawateen Duniya Monthly November 2023 , Vol. 7, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2021-23
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13- 11-2023
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Dhananjay Singh, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025